میرے گزشتہ روز و شب

مکتبہ جامعہ دہلی

میرے گزشتہ روز و شب

اسی مصنّف کی دوسری تصانیف

شعر

بیکراں سنہ ۱۹۴۹ء، سنہ ۱۹۵۴ء، سنہ ۱۹۵۶ء

ہندی رسم الخط میں سنہ ۱۹۶۱ء

ستاروں سے ذرّوں تک سنہ ۱۹۵۱ء، سنہ ۱۹۵۳ء

وطن میں اجنبی سنہ ۱۹۵۸ء، سنہ ۱۹۶۴ء

گجراتی رسم الخط میں سنہ ۱۹۵۴ء

نوائے پریشاں سنہ ۱۹۶۱ء

انتخابِ آزاد (انجمنِ ترقیِ اردو ہند) سنہ ۱۹۵۶ء، سنہ ۱۹۶۰ء

کہکشاں (انتخابِ کلام) سنہ ۱۹۶۱ء، سنہ ۱۹۶۳ء

اردو (طویل نظم) سنہ ۱۹۵۱ء، سنہ ۱۹۵۴ء، سنہ ۱۹۵۶ء، سنہ ۱۹۶۲ء، سنہ ۱۹۶۵ء

ابوالکلام آزاد (مرثیہ) سنہ ۱۹۶۰ء

بنامِ نہرو سنہ ۱۹۶۴ء، سنہ ۱۹۶۵ء

نثر

اقبال اور اُس کا عہد سنہ ۱۹۶۱ء، سنہ ۱۹۶۴ء

تلوک چند محروم (تالیف) سنہ ۱۹۶۰ء

جنوبی ہند میں دو ہفتے سنہ ۱۹۵۲ء

میرے گزشتہ روز و شب

جگن ناتھ آزاد

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی

ملنے کے پتے

مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ

جامعہ نگر۔ نئی دہلی

شاخ دہلی

مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ

اُردو بازار

دہلی ۶

شاخ بمبئی

مکتبۂ جامعہ لمیٹڈ

پرنسس بلڈنگ۔ جے جے ہسپتال

بمبئی ۳

پہلی بار

۱۹۶۵ء

ایک روپیہ پچیس پیسے

کوہِ نور پریس، لال کنواں دہلی

لاہور

اور اُس کی یادوں

کے نام

سخن اگر ہمہ شوریدہ گفتہ ام چہ عجب
کہ ہر کہ گفت ز گیسوئے او پریشاں گفت

اقبال

غزل

مری عمرِ رواں ہے اور میں ہوں / یہ جنسِ رائگاں ہے اور میں ہوں

غمِ گم گشتگاں ہے اور میں ہوں / یہ وِردِ جاوداں ہے اور میں ہوں

کہاں ہو کارواں والو کہاں ہو / تلاشِ کارواں ہے اور میں ہوں

تصور میں بہاریں ہیں گل افشاں / نگاہوں میں خزاں ہے اور میں ہوں

ذرا آواز دے اے دورِ ماضی! / ترا وردِ نہاں ہے اور میں ہوں

فقط میری خموشی ہے غزل خواں / سکوتِ بیکراں ہے اور میں ہوں

چمن والو! خبر بھی ہے تمھیں کچھ / کہ یادِ آشیاں ہے اور میں ہوں

مری تقدیر کانٹے چن رہی ہے / بہارِ بوستاں ہے اور میں ہوں

مرے نغمات پر خوش ہونے والے / مرا سوزِ نہاں ہے اور میں ہوں

کہوں کس سے کہ اس دورِ نوا میں / فقط میری فغاں ہے اور میں ہوں

ترستی ہیں خریداروں کو نظریں / لبِ گوہر فشاں ہے اور میں ہوں

کوئی یہ کارواں والوں سے کہہ دے / تلاشِ کارواں ہے اور میں ہوں

نظر پھر دشمنوں کو ڈھونڈھتی ہے / جفائے دوستاں ہے اور میں ہوں

میں اپنے آپ کو گم کر چکا ہوں / یہ احساسِ زیاں ہے اور میں ہوں

قریبِ گلستاں پھرتا ہوں لیکن / تلاشِ گلستاں ہے اور میں ہوں

مرے اشعار کی روداد آزاد!
مرا خونِ رواں ہے اور میں ہوں

چساں آدابِ محفل را نگہ دارند و می سوزند

مپرس از ما شہیدانِ نگاہے بر سرِ راہے

اقبال



میرے گزشتہ روز و شب

مغربی پنجاب میں دریائے سندھ کے اُس پار ایک چھوٹا سا شہر ہے عیسیٰ خیل۔ میں نے اِس شہر میں ۵۔ دسمبر ۱۹۱۰ء کی صبح کو آنکھ کھولی۔ چار پانچ سال کی عمر میں یہ شہر مجھ سے چھُوٹ گیا۔ لیکن اُس وقت کے نقوش یادوں کے شبستاں میں اِس طرح جگمگا رہے ہیں گویا ابھی کل کی بات ہے۔

عیسیٰ خیل اُس زمانے میں اگرچہ تحصیل کا صدر مقام تھا، لیکن تھا ایک بہت ہی چھوٹا سا شہر۔ آخری بار میں نے اس شہر کو ۱۹۳۴ء میں دیکھا۔ اُس وقت تک اِس کے طُول و عرض میں کوئی خاص فرق نہیں آیا تھا۔ اب پاکستان بننے کے بعد مُمکن ہے اِس کا شمار بھی بڑے شہروں میں ہونے لگا ہو۔ لیکن یہ شہر چھوٹا ہو یا بڑا میرا وطنِ مالوف ہے، اور میری نظر میں اس کی اہمیت کسی بھی بڑے شہر سے کم نہیں۔ یورپ کے اکثر ممالک اور بڑے بڑے شہر دیکھنے کے بعد بھی اگر کسی جگہ کے دیکھنے کی حسرت اِس وقت دل میں ہے تو وہ یہی چھوٹا سا شہر ہے عیسیٰ خیل۔

اتفاق کی بات ہے کہ پاکستان جانے کے مواقع مجھے متعدد بار ملے ہیں، لیکن اس شہر کو ایک بار چھوڑنے کے بعد دیکھنے کی صورت پیدا نہیں ہو سکی۔ سرگودھا اور اُس کے قریب نئی بستی جوہرآباد تک بھی میں گیا لیکن اپنی زادبوم کو جو وہاں سے بہت قریب ہے نہ دیکھ سکا۔ نہ جانے یہ حسرت کب پوری ہو۔

ایسے ہے وطن کی اب تمنّا دل میں جیسے کوئی چبھتا ہوا کانٹا دل میں
کل تک جو مری نظر میں لہراتے تھے اب ہیں وہ تمام شہر و صحرا دل میں

یہاں والد محترم اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ لیکن اس کے باوجود اُنھوں نے میری تعلیم کی ابتدا گھر ہی پر کی۔ مجھے یاد ہے کہ اُنھوں نے گتّے کے متعدّد ٹکڑوں پر "ا" "ب" لکھ کر مجھے دیئے، اور اُنھیں کی مدد سے مجھے اَبجد سے آشنا کیا۔

اس منزل سے آگے گزرا تو ایک دن والد نے دیوانِ غالب کھول کر میرے سامنے رکھا اور ایک خاص غزل پڑھنے کو کہا۔ میں نے وہ غزل پڑھی۔ والد کہنے لگے کہ اب تم امتحان میں پاس ہو۔ میں نہ سمجھا کہ ان کا مطلب کیا ہے۔ ہاں یہ واقعہ مجھے ہمیشہ یاد رہا، اور جب کئی سال بعد میں نے اُن سے پوچھا کہ اس امتحان کی نوعیّت کیا تھی تو اُنھوں نے بتایا کہ میں دیکھنا چاہتا تھا تم شعر موزوں پڑھ سکتے ہو یا نہیں۔

وہ غزل یہ تھی۔

کوئی اُمّید بر نہیں آتی کوئی صورت نظر نہیں آتی

پانچ برس کا تھا کہ والد کا تبادلہ عیسیٰ خیل سے کلور کوٹ کے اسکول میں ہو گیا۔ عیسیٰ خیل سے کلور کوٹ جانے کے لئے کالا باغ کے مقام پر دریائے سندھ کو عبور کرنا پڑتا تھا۔

کالا باغ ایک بڑا ہی پُرفضا مقام ہے۔ دریا کے کنارے آباد ہے۔ نمک کے پہاڑوں کا سلسلہ دُور تک چلا گیا ہے۔ ان پہاڑوں پر خوبصورت مکان بنے ہوئے ہیں۔

اُس وقت تک ابھی یہاں دریا پر پل نہیں بنا تھا۔ چھوٹی بڑی کشتیاں یا اسٹیمر ہی آمدورفت کے ذرائع تھے۔ ہمارا اسٹیمر روانہ ہوا ہی تھا کہ پہاڑوں پر بنے ہوئے مکان دیکھ کر والد نے ایک مصرع پڑھا۔

پہاڑوں کے اُوپر بنے ہیں مکان

اور مجھ سے دوسرا مصرع لگانے کو کہا۔ میں نے فوراً کہا۔

عجب ان کی صورت عجب ان کی شان

والد نے کہا "صُورت" نہیں "شوکت" کہو۔ میں اُس وقت تو "صُورت" اور "شوکت" کا فرق نہ سمجھ سکا، لیکن مُدّت بعد جب دونوں لفظوں کا فرق مجھ پر ظاہر ہوا تو اس بات کی اہمیت سمجھ میں آئی کہ شعر میں رہنمائی اور مشورے کی اہمیت کتنی زیادہ ہے۔

یہاں کلور کوٹ میں مَیں باقاعدہ طور پر اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ اُس زمانے کی اور تو کوئی بات مجھے تفصیل سے یاد نہیں لیکن اتنا یاد ہے کہ ہر ہفتے اسکول میں ایک

اَدَبی جلسہ منعقد ہوا کرتا تھا۔ اس میں طلبہ زبانی یاد کی ہوئی اُردو اور انگریزی نظمیں سُناتے تھے۔ تقریریں بھی ہوتی تھیں اور کبھی کبھار ڈرامہ بھی ہو جاتا تھا۔ میں ان پروگراموں میں اکثر حصّہ لیتا تھا، اور اِس طرح سے اُردو اور انگریزی کی متعدد نظمیں مجھے زبانی یاد ہو گئی تھیں۔

میں آٹھ برس کا تھا کہ ضلع کے صدر مقام میانوالی میں ایک جلسہ منعقد ہوا۔ معلوم نہیں جلسہ کس سلسلے میں تھا۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ وِلسن صاحب نامی ایک انگریز اس جلسے کے صدر تھے۔ میں نے اس جلسے میں چودھری خوشی محمد ناظرؔ کی نظم "جوگی" اوّل سے آخر تک زبانی سُنائی اور اس نظم خوانی کا چرچا سارے ضلعے میں مُدّتوں رہا۔ انگریز صدر کی تھپکی مجھے ابھی تک یاد ہے۔

اس سے ایک برس بعد میری زندگی ایک نئے اور عجیب و غریب ادبی تجربے سے دوچار ہوئی۔ والد نے مجھ سے کہا کہ چلو تمھیں بھیرے لے چلیں۔ ایک مُشاعرے میں۔ "مُشاعرہ" — یہ میرے لئے ایک نیا لفظ تھا۔ میں نے اس کے معنی پوچھے، والد نے اگرچہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا، لیکن اِس وضاحت کے باوجود مشاعرے کا پورا مفہوم میری سمجھ میں نہ آسکا۔

خیر، مقررہ تاریخ کو میں والد کے ہمراہ روانہ ہوا۔ راستے میں غالباً کُندیاں نامی ایک اسٹیشن پر ریل تبدیل کرنا تھی۔ وہاں بھیرے کی ریل کے انتظار میں ہمیں کافی دیر رُکنا پڑا۔ اس لئے کہ ایک ٹرین لاہور سے آتی تھی، اور اس کے بعد بھیرے کی ٹرین روانہ ہوتی

تھی۔ لاہور کی ٹرین آئی تو ایک صاحب اس میں سے اُترے اور بڑے تپاک سے والد کے ساتھ بغل گیر ہوئے۔ یہ صاحب سیکنڈ کلاس میں سے اُترے تھے۔ ہم لوگ اِنٹر میں سفر کر رہے تھے۔ اس وقت تک میرا خیال یہ تھا کہ سیکنڈ کلاس میں صرف اسکولوں کے انسپکٹر سفر کرتے ہیں۔ اور اسکولوں کے انسپکٹر سے بڑے عہدے کا تو میں تصور ہی نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن تھوڑی دیر میں پتہ چلا کہ یہ صاحب اسکولوں کے انسپکٹر نہیں ہیں بلکہ شاعر ہیں۔ اور اُن کا نام ہے حفیظ جالندھری۔ یہ نام بھی میرے لئے نیا تھا۔ بلکہ میں تو اس وقت تک کسی بھی شاعر کے نام سے آشنا نہیں تھا۔ ہاں اپنی درسی کتابوں میں جن شعراء کی نظمیں پڑھ چکا تھا اُن کے ناموں سے واقف تھا۔ اور ان کے علاوہ بعض اُن شعراء کے نام سے جن کی نظمیں کبھی کبھار "نونہال" اور "گلدستہ" میں دیکھنے کا اتفاق ہو چکا تھا۔ اِن درسی کُتب میں ایک تو میرے والد کی نظمیں شامل تھیں۔ باقی شعراء کے نام جن سے میں اُن کی نظموں کی بدولت واقف ہوا تھا، یہ تھے۔ مولانا حالی، مولانا محمد حسین آزاد، مولانا اسمٰعیل میرٹھی اور نظیر اکبر آبادی، اور میں سمجھتا تھا کہ ان اشخاص کے علاوہ دنیا میں اور کوئی شاعر ہے ہی نہیں۔ چنانچہ جب ریل چلنے لگی اور ہم لوگ جا کر اپنے ڈبے میں سوار ہوئے تو پہلا سوال میں نے والد سے یہ کیا کہ ان کی نظمیں تو "مرقعِ ادب" میں نہیں ہیں۔ پھر یہ شاعر کیسے ہیں۔ والد نے کہا ابھی اِن کی نظمیں درسی کتب میں شامل نہیں ہوئیں۔ کچھ مدّت کے بعد ہو جائیں گی۔

بھیرے پہنچے تو میرے لئے مشاعرے کے وقت کا انتظار کرنا مشکل ہو گیا۔ میں اس

خیال میں تھا کہ وہاں جو نظمیں پڑھی جائیں گی وہ کچھ اِس طرح کی ہوں گی جیسی "مرقعِ ادب" میں شامل ہیں۔ مثلاً

"جس وقت بڑھا ریچھ ہوا ریچھ کا بچّہ"

"گھنگھور گھٹا تُلی کھڑی تھی ‏ ‏ ‏ ‏ اور بُوند ابھی نہیں پڑی تھی"

"سہانا سہانا سحر کا سماں ہے"

"ضعیفہ پھٹے کپڑے پہنے کھڑی ہے ‏ ‏ ‏ ‏ ضعیفی سے اُس کی کمر جھک گئی ہے"

"مسافر کہیں ایک رستے میں تھا ‏ ‏ ‏ ‏ وہ چوروں کے ہاتھوں میں جا کر پھنسا

"لیے اُس بچارے کے کپڑے اُتار ‏ ‏ ‏ ‏ کیا گھائل اور ادھ موا مار مار"

لیکن وہاں تو معاملہ ہی کچھ اور تھا۔ والد نے جو نظم پڑھی وہ تو بالکل ہی میری سمجھ میں نہیں آئی۔ حفیظ صاحب کی نظم مقابلتہً آسان تھی، لیکن بحیثیتِ مجموعی مجھے پتہ نہ چل سکا کہ نظم کس عنوان یا موضوع پر ہے۔ ایک ہی مصرع میری سمجھ میں آ رہا تھا "میر اسلام لے جا" ان دو کے علاوہ باقی تمام شعراء تقریباً مقامی تھے۔ اور اُن کا کلام بھی میری سمجھ سے باہر تھا۔

اس مشاعرے کا اہم ترین واقعہ "یہ تھا کہ (غالباً منتظمین میں سے) ایک صاحب نے مجھ سے پوچھا، تمھیں بھی کوئی نظم یاد ہے۔ میں نے کہا جی ہاں کئی نظمیں یاد ہیں۔ اُنھوں نے عنوان پوچھے، میں نے کہا "جوگی" "ہندو مسلمان" "پہلے کام پیچھے آرام" اور اسی طرح سے دو چار نام اور میں نے گن سُنائے۔ چنانچہ اُنھوں نے مجھ سے کہا کہ اچھا

تم ہندو مسلمان" سناؤ۔ چنانچہ میں نے والد کی یہ نظم اوّل سے آخر تک زبانی سُنا دی اور ایک لُنگی انعام میں پائی۔ یہ انعام پاکر میں پھولا نہ سمایا، کیوں کہ اس سے قبل اسکول میں جو انعام میں نے حاصل کئے تھے وہ اس کے مقابلے میں معمولی اور کم پائے کے تھے اور یہ انعام ایسا تھا جسے دیکھ کر میرے سب ہم جماعت مرعوب ہو سکتے تھے۔

مشاعرے کے بعد ہم جائے قیام پر واپس پہنچے تو والد نے پوچھا، کہو مشاعرہ پسند آیا؟ میں نے کہا میری سمجھ میں تو کوئی نظم آئی نہیں۔ کہنے لگے حفیظ صاحب کی نظمیں بھی؟ میں نے کہا، وہ بھی سمجھ میں نہیں آئیں۔ چنانچہ دوسرے دن جب والد حفیظ صاحب سے ملنے گئے تو اُنھوں نے اُن سے کہا کہ جگن کا تو مشاعرے میں آنا بیکار ہی رہا۔ یہ کہتا ہے کوئی نظم میری سمجھ میں آئی ہی نہیں۔ یہ سُنتے ہی حفیظ صاحب نے اپنی ایک کتاب نکالی "ہندوستاں ہمارا" اور اُس میں سے ایک نظم اپنے خاص انداز میں جو سُنائی تو مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے فضا میں چاروں طرف جادو کا عمل ہو گیا ہو۔ نظم کا عنوان تھا "سروپ نکھا کی لچھمن سے ملاقات" مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں اپنی آنکھوں سے سروپ نکھا کی ناک کے کٹنے کا نظارہ دیکھ رہا ہوں اور وہ روتی پیٹتی ہوئی اپنے بھائی کے دربار میں پہنچی ہو اور یہ سب کچھ میری آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہو۔ میں نے والد سے اصرار کیا کہ یہ کتاب میں ضرور لوں گا۔ چنانچہ حفیظ صاحب نے اسی وقت اس کتاب کی ایک جلد میرے حوالے کی اور میں اُسے اپنی عزیز ترین متاع کی طرح اپنے ساتھ لے آیا۔

یہ کتاب میں نے نہ جانے کتنی بار پڑھی، اور کے برس تک پڑھتا رہا۔ لیکن اتنا جانتا ہوں کہ آٹھویں جماعت میں یہ کتاب مجھے اوّل سے آخر تک زبانی یاد تھی۔ اس کی ہر نظم، ہر شعر اور ہر مصرع مجھے ازبر تھا۔ چنانچہ آٹھویں کے امتحان میں جب تاریخ کا پرچہ تھا تو میں نے تمام سوالات کے جواب نظم میں دئے، اور وہ جواب اسی "ہندوستاں ہمارا" کی منظومات پر مشتمل تھے۔

امتحانات کی تاریخ میں غالبًا یہ اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ تھا۔ سارے راولپنڈی ڈویژن میں اس کا چرچا ہوا۔ طالب علم کا نام تو کسی کو معلوم نہیں تھا۔ رول نمبر تھے لیکن لاہور کے اخبارات میں جب یہ خبر چھپی کہ ایک طالب علم نے تاریخ کے پرچے میں تمام سوالات کے جوابات حفیظ جالندھری کے مجموعۂ نظم "ہندوستاں ہمارا" میں سے دئے ہیں تو میں نے یہ تمام اخبارات سنبھال کر رکھ لئے کہ اگر ہمارا نام نہیں چھپا تو کیا ہوا ذکر تو ہمارا ہی ہے۔

کچھ مدّت بعد والد صاحب ایک اور مشاعرے میں شرکت کے لئے جانے لگے۔ (یہ مشاعرہ ملتان میں تھا) تو مجھ سے انھوں نے پوچھا چلو گے؟ میں نے کہا اگر حفیظ صاحب آرہے ہوں تو ضرور چلوں گا۔ حفیظ صاحب کی مشاعرے میں متوقع شرکت کی اطلاع والد صاحب کو مل چکی تھی، چنانچہ حفیظ صاحب کو سننے کے شوق میں میں ملتان روانہ ہو گیا۔

یہاں بھی مشاعرے کی عام کیفیت تو وہی رہی یعنی میری سمجھ سے بالا، لیکن ایک تو

میں نے قدرے توجّہ سے شعراء کا کلام سُنا اس لئے زیادہ نہیں تو کسی حد تک ضرور محظوظ ہوا۔ دوسرا یہ اُمّید آخر تک رہی کہ "ہندوستاں ہمارا" سننے کا موقع ملے گا۔ یہ اُمّید اگرچہ پوری نہیں ہوئی، لیکن اس اُمّید نے میرے لئے مشاعرے میں ایک دل چسپی پیدا کر دی تھی۔

اِسی مشاعرے ہی میں نے پہلے پہل پنڈت ہری چند اختر کو دیکھا، اور اُن کے کلام کے ساتھ اُن کے لطائف بھی سُنے۔ ہُوا یوں کہ اختر صاحب نے جو غزل پڑھی وہ سامعین کو بہت پسند آئی۔ اور انھوں نے "ایک اور" "ایک اور" کا تقاضا کیا۔ اس پر پنڈت جی نے سامعین کو بتایا کہ

"ایک صاحب تھے افیونی۔ اُنھوں نے افیون کی پِنَک ہی میں سائیس کو حکم دیا کہ گھوڑے پر زین کس دو۔ سائیس نے جواب دیا کہ جناب کس دی ہے۔ اُس نے کہا کہ ایک اور بھی کس دو"

اس پر ایک زوردار قہقہہ پڑا۔

اس مشاعرے کی مجھے زیادہ باتیں تو یاد نہیں۔ لیکن اتنا یاد ہے کہ ایک شاعر صاحب نے نظم شروع کرنے سے پہلے کہا "حضرات میری نظم کا عنوان ہے "آنسو" اور پھر ترمیم پیش کرتے ہوئے کہا کہ "میرا آنسو" اس پر ایک آواز آئی "میرا اپنا آنسو" فوراً ایک اور آواز آئی "میرا اپنا پیارا آنسو" اور پھر ایک طرف بیٹھے ہوئے کچھ لوگوں نے ہچکیاں لے کر رونا شروع کیا۔ میں حیران تھا کہ یا الٰہی یہ کیا معاملہ ہے۔ بعد میں پتہ چلا کہ یہ ہوٹنگ تھی جو مشاعرے کا ایک جزو لاینفک ہے۔

حفیظ صاحب بھیرے میں نظم "ہندو مسلمان" میری زبانی سُن چکے تھے۔ یہاں اُنھوں نے اعلان کر دیا کہ اب یہ بچّہ آپ کو نظم سُنائے گا اور مجھ سے کہا کہ پڑھو۔ میں نے پُوچھا کون سی "ہندو مسلمان" یا "آندھی"۔ اُنھوں نے کہا "آندھی" اور میں گراموفون ریکارڈ کی طرح شروع ہو گیا۔ ذرا سا میرا قد تھا، بس میز ہی کی اونچائی کے برابر، اور مشاعرہ یہ بہت بڑا تھا، بھیرے کے مشاعرے سے کہیں بڑا۔ وہ اسکول کے ایک ہال میں تھا، یہ باہر وسیع و عریض میدان میں۔ حفیظ صاحب نے مجھے دونوں ہاتھوں سے اُٹھا کر میز پر کھڑا کر دیا، اور میں نے وہ نظم

آندھی کلور کوٹ کی چلتی ہے کس طرح
اب یہ دکھا کہ رنگ بدلتی ہے کس طرح

آندھی کی رفتار سے سُنا ڈالی۔

یہ مشاعرہ طرحی تھا، اور اس میں دو طرحیں تھیں۔ ایک مصرع جوش ملیح آبادی کا تھا۔

آگ بننا ہی نہیں ہے آگ برسانا بھی ہے

اور دوسرا تھا۔

کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم

حفیظ صاحب کی غزل

چُپ ہو رہیں گے کچھ نہ کہیں گے زباں سے ہم
یہ اعترافِ عجز بھی معیوب ہے تو خیر

اسی مشاعرے کی یادگار ہے، اور یہ غزل اُنھوں نے مشاعرے سے تھوڑی دیر قبل

ملتان میں پہنچنے کے بعد "فی البدیہہ" کہی تھی۔ بال کرشن بتراآبر، یکے از منتظمین مشاعرہ کے مکان پر، والد صاحب کی غزل بھی فی البدیہہ ہی تھی، اور اُنھوں نے حفیظ صاحب کی غزل کے بعد اپنی غزل کہی تھی۔ اس غزل میں حفیظ کے ایک مصرعے کی تضمین بھی ہے۔

مٹ مٹ گئے مگر نہ دبے آسماں سے ہم ۔۔۔ ہاں بے مبالغہ ہے یہ کہنا حفیظ کا

اوّل الذکر مصرعے پر تضمین ایک مخمّس کی صورت میں والد پہلے ہی سے کر کے لائے تھے۔

یہاں کلورکوٹ سے میں نے آٹھویں جماعت کا امتحان پاس کیا۔ میری عمر اُس وقت بارہ برس کی تھی۔ اس وقت تک صورت یہ تھی کہ میں کبھی کبھار کوئی مصرع موزوں کر لیا کرتا تھا یا کبھی کوئی شعر ہو جاتا تھا۔ اس سے زیادہ نہیں۔ ہاں یاد آیا میں نے اس دوران میں ایک نظم بھی کہی تھی جو ہفتہ وار "گلدستہ" میں شائع ہوئی تھی۔ وہ نظم رسالہ "گلدستہ" ہی کے بارے میں تھی۔

اگلے دو برس میں نے میانوالی میں گزارے۔ جہاں سے میں نے دسویں جماعت کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد ۱۹۴۳ء میں ڈی اے وی کالج راولپنڈی میں داخل ہوا۔ والد نے بھی کوشش کر کے اپنا تبادلہ یہیں کرا لیا اور یہیں سے دراصل میری شعر و شاعری کی ابتدا ہوئی۔

عبدالحمید عدم ان دنوں راولپنڈی میں تھے، ان کے ابتدا ہی سے والد کے ساتھ دوستانہ مراسم ہو گئے تھے، وہ ہمارے گھر ہفتہ میں تین چار بار آیا کرتے تھے اور رات کے دو دو بجے تک والد کے ساتھ ان کی شعر و سخن کی محفل گرم رہتی تھی۔ وہ اپنے رسائل اور

دوسری ڈاک بھی ہمارے پتے پر منگوایا کرتے تھے، اور جب وہ اپنی ڈاک کھولتے تھے تو ہر رسالہ اور ہر خط کسی نہ کسی ادبی گفتگو کا موضوع بن جایا کرتا تھا۔

"نگار" جب بھی آتا حضرت نیاز فتح پوری اور اُن کی تصانیف موضوعِ گفتگو بن جاتی تھیں۔ اسی طرح "ساقی" کا ریپر کُھلتے ہی شاہد احمد اور دہلی کے تذکرے شروع ہو جاتے تھے۔ ہمیں باقاعدہ موصول ہونے والے ادبی رسائل کی تعداد خاصی زیادہ تھی۔ کچھ عدم صاحب کے نام آتے تھے کچھ والد کے نام۔ میں بھی کبھی کبھار ان رسائل کی ورق گردانی کر لیا کرتا تھا، اور جوش اور فیض کے کلام سے میری دلچسپی شروع ہو گئی تھی۔

والد اور عدم کی بات چیت میں بڑے غور سے سُنتا تھا۔ ادب کا کون سا پہلو تھا جو ان کی گفتگو میں زیرِ بحث نہ آتا تھا۔ غالب اور اقبال کے کلام سے لے کر موجودہ زمانہ اختر کی شاعری تک سب موضوعات پر گفتگو ہوتی تھی۔

اسی زمانے میں عدم صاحب نے اپنا پہلا مجموعۂ کلام "نقشِ دوام" مُرتّب کیا۔ آج یہ مجموعہ نایاب ہے اور اس میں جس قسم کی شاعری ہے وہ عدم کے آج کے رنگِ سخن سے بہت مختلف ہے۔ عدم کے کلام کی ابتدا غزل سے نہیں بلکہ نظم سے ہوئی، اور اس مجموعے میں اگرچہ غزلیں بھی موجود ہیں لیکن اصل میں یہ عدم کا ایک نمائندہ مجموعۂ نظم ہے۔ جس کا مطالعہ عدم کے شاعرانہ ارتقا کا جائزہ لینے کے لئے بہت ضروری ہے۔

کبھی کبھار والد سے ملنے کے لئے عبدالعزیز فطرت، اظہر امرتسری اور ضیا سرحدی بھی آ جایا کرتے تھے۔ اظہر اور ضیا کم آتے تھے۔ فطرت مقابلتاً زیادہ، لیکن اتنا نہیں

جتنا عدم۔ ان کا تو ہر روز کا معاملہ تھا۔ عدم صاحب بالعموم دفتر سے چھٹی ہوتے ہی سائیکل پر پاؤں رکھتے اور ہمارے یہاں آجاتے تھے۔ رات کو بہت دیر گئے رخصت ہوتے تھے۔ اُن کے ایک دوست مختار قریشی بھی اُن کے ساتھ ہی آتے تھے۔ مختار قریشی اکثر ہمیں بتاتے تھے کہ رات کو بائیسکل میں لیمپ نہ ہونے کی وجہ سے عدم صاحب کا چالان ہو گیا۔

یہ صورتِ حال کوئی تین برس تک رہی اور میں راولپنڈی سے باہر نکلنے سے پہلے ہی ہندوستان کے شاعرانہ ماحول کی ایک ہلکی سی جھلک عدم اور دادا کی تین برس کی گفتگو میں دیکھ چکا تھا۔ اس مختصر سے وقفے کے بعد عدم صاحب مصر چلے گئے، اور یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ لیکن میرے دل میں ذوقِ ادب اور ذوقِ مطالعہ کا جو شعلہ اُس زمانے میں روشن ہوا تھا وہ بڑھتا ہی گیا۔

عبدالعزیز فطرت راولپنڈی کی ادبی محفلوں کی جان تھے۔ شہر میں انجمن ترقیٔ اُردو کا قیام اور پہلے یومِ اقبال کا انعقاد انھیں کی کوششوں کا مرہونِ منّت ہے۔ اِس یومِ اقبال کا اجلاس دو دن منعقد ہوا۔ دونوں دن شیخ سر عبدالقادر نے صدارت کی۔ پہلے دن یہ اجلاس ڈی اے وی کالج میں ہوا، اور دوسرے دن گارڈن کالج میں۔ ممکن ہے اتنا بڑا اجلاس لاہور یا حیدر آباد میں منعقد ہوا ہو۔ لیکن امکان نہیں کہ کسی اور شہر میں اس طرح دو دن تک مسلسل یومِ اقبال منایا جاتا رہا ہو۔ اور اس ساری کامیابی میں عبدالعزیز فطرت کا خلوص اور اُن کی شبانہ روز کی دوڑ دھوپ کار فرما تھی۔

میں نے اس میں اپنا مقالہ "اقبال کی منظر نگاری" پڑھا۔ جو شیخ سر عبدالقادر (مرحوم) کو اتنا پسند آیا کہ وہ اسے اپنے ساتھ لاہور لے گئے اور اسے "ہمایوں" میں شائع کرایا۔ بعد میں یہ "ہمایوں" سے "ادبی دنیا" میں نقل ہوا۔

عبدالعزیز فطرت ہی کے اصرار پر میں نے باقاعدہ طور پر انجمن کی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ گارڈن کالج ہماری سرگرمیوں کی جولانگاہ تھی۔ ہر پندرھویں بیسویں دن ہم وہاں کوئی نہ کوئی ادبی جلسہ منعقد کرویا کرتے تھے۔ جب کوئی موضوع نہ ملتا تو طرحی یا غیر طرحی مشاعرے کا ہم لوگ انعقاد کر دیتے تھے والد بھی ان مشاعروں میں باقاعدگی سے شریک ہوتے تھے، اگرچہ ہمارا مکان گارڈن کالج سے بہت دُور تھا۔ عدم صاحب کرکٹ کے میدان سے سیدھے مشاعرہ گاہ میں پہنچتے تھے۔ اکثر وہ کرکٹ کا بیٹ ساتھ ہی لے کر آتے تھے۔

ضیا سرحدی ان مشاعروں کی ایک خاص شخصیت تھی۔ ان کی شاعری فلسفیانہ شاعری تھی۔ انداز بیان سلجھا ہوا اور ژولیدگی سے پاک تھا۔ فلسفیانہ افکار کو وہ بڑی خوبصورتی سے نظم کرتے تھے۔ اُن کی ژرف نگاہی اُردو شاعری کے لئے بڑی دولت تھی۔ افسوس ہے کہ اُن کا کوئی مجموعۂ کلام شائع نہیں ہوا۔ ہاں دو مثنویاں جو قریباً دو دو سو اشعار پر مشتمل تھیں "مقامِ محمود" اور "ہبوطِ آدم" کے نام سے شائع ہوئی تھیں۔ برج لال رعنا انھیں کے شاگرد ہیں۔ اگر رعنا صاحب کہیں سے اپنے اُستاد کا کلام ڈھونڈھ نکالیں اور اُس کی اشاعت کا بندوبست کر دیں تو یہی نہیں کہ استاد

مرحوم کی رُوح کو شاد کام فرمائیں گے بلکہ اُردو ادب پر بھی اُن کا بہت بڑا احسان ہوگا۔

ڈی اے وی کالج سے ایف۔ اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد میں بی۔ اے میں آیا تو اسی گارڈن کالج میں داخلہ لے لیا گارڈن کالج میں میں نے دوستوں کے ساتھ مل کر بزمِ ادب کی بنیاد ڈالی۔ اس کالج میں اگرچہ طلبہ کی طرف سے ادبی اجلاس اکثر منعقد ہوا کرتے تھے، لیکن با قاعدہ طور پر اُردو کی کسی بزم کی تشکیل ابھی تک نہیں ہوئی تھی۔ کالج کے وائس پرنسپل ریورینڈ جے۔ بی کنگز امریکی پادری تھے اور اردو سے اُنھیں بہت دلچسپی تھی۔ اُنھوں نے بزم کی سرگرمیوں کو ہمیشہ سراہا اور اس کی ہمّت افزائی کی۔ ہم لوگوں نے اس بزم کے زیرِ اہتمام اکثر مشاعرے اور اجلاس جن میں یوم پریم چند خاص اہمیت رکھتا ہے، منعقد کئے۔ کالج میگزین کا میں ایڈیٹر تھا، اس میں میرے اشعار شائع ہوا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ "ادبی دُنیا" (لاہور) اور زمانہ (کانپور) میں میرا کلام شائع ہونا شروع ہو گیا تھا۔ منشی دیا نرائن نگم آنجہانی اور مولانا صلاح الدین احمد کی حوصلہ افزائی کا اس موقع پر ذکر نہ کرنا ایک صریح احسان ناشناسی ہوگی۔

راولپنڈی کی ادبی شخصیتوں میں یوں تو کئی نام اس داستان میں شامل ہونے سے رہ گئے ہوں گے لیکن ان میں ایک نام ایسا بھی ہے جس کے بغیر اُس زمانے کی راولپنڈی کا ادبی ذکر نامکمل رہے گا، اور یہ نام ہے فضل الرحمٰن اشک کا۔ مجھے یاد نہیں کہ فضل الرحمٰن اشک ہماری ادبی سرگرمیوں میں کبھی شریک ہوئے ہوں۔ لیکن اُن کا تعاون ہمیں ہر لمحہ

اور ہر قدم پہ حاصل تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ اُن کے بکھرے ہوئے ذوقِ ادب کی وجہ سے اُن کی دُکان "ایشیاٹک آپٹیکل ورکس" ہم لوگوں کے لئے کعبہ مقصود تھی۔ 'ایشیاٹک آپٹیکل ورکس آج بھی راولپنڈی میں ایڈورڈز روڈ پر موجود ہے' اور پاکستان بننے کے بعد اس کی ایک شاخ اِس وقت کراچی میں ہے۔ ہمارے دوست اشک صاحب کراچی کی شاخ کے مالک و منتظم ہیں۔ اشک صاحب مہینوں میں ایک آدھ غزل کہتے ہیں لیکن انتہائی پاکیزہ و شستہ اور بڑے رکھ رکھاؤ کے ساتھ۔ اپنا کلام یہ رسالوں میں نہیں بھیجتے محض احباب ہی کو سُناتے ہیں، اور بڑی خوبی اُن کی غزل کی یہ ہے کہ اس کے اکثر اشعار ان کے احباب کو زبانی یاد رہ جاتے ہیں۔

بی۔ اے کے بعد میں راولپنڈی سے چلا تو لاہور کی کھلی فضائیں پرواز کے لئے موجود تھیں۔ یہاں کا ہر فرد ایک انجمن اور ہر گوشہ ایک بساطِ ادب تھا۔ یہاں سب سے پہلے ملاقات مولانا تاجور نجیب آبادی سے ہوئی۔ اُن کے مشوروں اور فیضِ صحبت کے متعلق مجھے یہی کہنا ہے کہ ؎

جو بیٹھو با ادب ہو کر تو اُٹھو باخبر ہو کر

مولانا کی خدمت میں مجھے کرپال سنگھ بیدار لے کر گئے تھے۔ کرپال سنگھ بیدار سے تعارف وقار انبالوی کے ذریعے سے ہوا تھا، اور وقار انبالوی سے میں لاہور آنے کے بعد خود ہی جا کر ملا تھا۔ اس لئے کہ "چندن" کی ایڈیٹری کے زمانے میں وقار انبالوی نے والدِ محترم کی کتاب "گنجِ معانی" پر ایک طویل مقالہ لکھا تھا جو مجھے بہت پسند

آیا تھا اور میں نے اُن کے ساتھ ایک دلی قرب محسوس کیا تھا۔

مولینا اس زمانے میں مزنگ والے مکان میں رہتے تھے۔ جب میں اور بیدار وہاں پہنچے تو ایک صاحب وہاں پہلے سے بیٹھے تھے۔ یہ صاحب کمیونزم کے موضوع پر مولینا سے گفتگو کر رہے تھے، اور انھیں کمیونزم کی خوبیوں سے واقفیت بہم پہنچا رہے تھے۔ ملاقات ہوئی تو پتہ چلا کہ آپ گوپال متّل صاحب ہیں۔

مولینا کے ساتھ اُس وقت کیا باتیں ہوئیں مجھے تفصیل سے یاد نہیں۔ غالباً میرے ساتھ اُن کی بہت کم بات ہوئی۔ زیادہ تر وقت وہ بیدار اور متّل سے باتیں کرتے رہے۔ مجھ سے اُنھوں نے والد کی خیریت پوچھی اور یہ بھی پوچھا کہ "کبھی شعر کہتے ہو۔" میں ابھی جواب کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ بیدار صاحب نے کہا مولینا آپ نے "ادبی دنیا" میں ان کا کلام نہیں دیکھا؟ ان کا کلام "زمانہ" کانپور میں بھی چھپتا ہے۔ "ہمایوں" میں ان کا ایک مقالہ اقبال کی شاعری پر شائع ہوا ہے۔ مولینا نے میری طرف کچھ اس انداز سے دیکھا جیسے بیدار صاحب کی کسی بات کا اُنھیں یقین نہ آ رہا ہو۔

تھوڑی دیر کے بعد ہم لوگ وہاں سے اُٹھ آئے۔ واپسی پر گوپال متّل بھی ہمارے ساتھ تھے۔ بیدار صاحب کا قیام ریلوے روڈ کے ایک ہوٹل میں تھا۔ وہ ہم دونوں کو اس ہوٹل میں لے آئے۔ وہاں ہم نے کھانا کھایا، اور کافی رات گئے ایک دوسرے سے جُدا ہوئے۔

قیامِ لاہور کی داستان بہت طویل ہے۔ ع گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل۔ والا

معاملہ ہے ؎

کہیں سے چھیڑوں میں اپنا قصّہ یہ دردِ فرقت کی داستاں ہے
سُناؤں بھی میں یہ قصّۂ غم اگر تو آخر کہاں سے پہلے

کلامِ اقبال کے ساتھ میری دلبستگی اُس زمانے میں شروع ہو گئی تھی جب ایف۔ اے میں مرغوب ایجنسی کے کتابچے میرے ہاتھ لگ گئے تھے اور مجھے "شکوہ" "جوابِ شکوہ" "شمع اور شاعر" اور "فریادِ اُمّت" ایسی نظمیں پڑھنے کا موقع ملا تھا۔ اس شاعری نے مجھ پر جو اثر کیا تھا اس کا بیان لفظوں میں ممکن نہیں۔ میرے دل میں اکثر یہ خواہش رہتی تھی کہ میں ان نظموں کے خالق کو ایک بار دیکھ لوں۔

اُس زمانے میں علّامہ اقبال کی صحت اچھی نہیں رہتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود میں نے اپنی خواہش کا اظہار وقار انبالوی سے کیا۔ انھوں نے کہا وہاں جانا کوئی مشکل نہیں۔ وہ تو کھُلا دربار ہے۔ اور پھر تم تو محروم کے فرزند ہو۔ تمھارے لئے کسی رکاوٹ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن نہ جانے کیا بات تھی کہ میں علّامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہونے کی خواہش کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔

ایک بار میں نے سالک صاحب سے عرض کیا کہ میں کسی روز آپ کے ساتھ علّامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوں گا۔ سالک صاحب نے کہا جب تم چاہو میرے ساتھ چل سکتے ہو۔ لیکن خدا جانے معاملہ کیا تھا، میکلوڈ روڈ سے میں گزر جاتا تھا اور اُن کی کوٹھی کی جانب قدم بڑھانے کا حوصلہ نہ ہوتا تھا۔ اصل میں میں گمان ہی نہ کر سکتا تھا

شکوہ" "جوابِ شکوہ" "شمع اور شاعر" "خضرِ راہ" "فریادِ اُمّت" اور "طلوعِ اسلام"
جیسی نظموں کا خالق کوئی عام انسان ہو سکتا ہے۔ میں علاّمہ کی خدمت میں حاضر ہوں گا
تو میرے مُنہ سے بات کیسے نکلے گی۔ کیا وہ ہماری آپ کی طرح کُرسی پر بیٹھے ہوں گے؟
پلنگ پر لیٹے ہوں گے؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ "بانگِ درا" کا مُصنّف ہماری آپ کی طرح کسی
سے بات کر رہا ہو، یا برآمدے میں چل پھر رہا ہو...... یہ کیسے ممکن ہے...... یہ کیسے ممکن
ہے...... علاّمہ اقبال سے ملاقات کیسے ممکن ہے؟

علاّمہ تاجور نے مجھ سے کہا اقبال کا کلام جتنا تمھیں زبانی یاد ہے اتنا شاید ہی کسی اور کو یاد ہو، اور حیرت ہے کہ تم نے اقبال کو ابھی تک دیکھا نہیں۔ پرسوں شام کو آؤ اُن کے پاس چلیں گے۔ وہ علیل ہیں۔ تھوڑی دیر بیٹھ کے اُٹھ آئیں گے۔ میں نے وعدہ کیا کہ ضرور آؤں گا، لیکن اُس دن میں مولینا کے وہاں کبھی نہیں پہنچا۔ کیوں کہ ہماری منزلِ مقصود علاّمہ اقبال کے درِ دولت تک رسائی تھی۔

گرچہ بہانہ جُو رہی میری نگاہِ بے ادب　　عینِ وصال میں مجھے حوصلۂ نظر نہ تھا

مولینا تاجور مرحوم مجھے حافظِ کلامِ اقبال کہا کرتے تھے۔ اسی خطاب سے میرا تعارف مشاعروں میں ہوتا تھا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ گورداس پور میں مشاعرہ تھا، مشاعرے میں مولانائے محترم نے مجھے حافظِ کلامِ اقبال کہہ کر سامعین سے میرا تعارف کرایا۔ یہ ایک بہت بڑا دعویٰ تھا۔ چنانچہ دوسرے دن جب تمام شعراء کھانے پر جمع ہوئے تو ایک ریشِ دراز بزرگ نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ رات مشاعرے میں مولانا تاجور

نے آپ کو حافظِ کلامِ اقبال کہا تھا۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ مثنوی "اسرارِ خودی" کس شعر سے شروع ہوتی ہے۔ میں نے جواب دیا جناب آپ نے واقعی مشکل سوال کیا ہے۔ اصل میں مثنوی "اسرارِ خودی" کے پہلے صفحے پر مولانا روم کے یہ اشعار درج ہیں

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گردِ شہر — کز دام و دد ملولم و انسانم آرزوست
زیں ہمرہانِ سست عناصر دلم گرفت — شیرِ خدا و رستمِ دستانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما — گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

اور اس مثنوی کے پہلے باب کی ابتدا نظیری کے اس شعر سے ہو رہی ہے۔

نیست در خشک و ترِ بیشۂ من کوتاہی
چوبِ ہر نخل کہ منبر نشود دار کنم

اس کے بعد مثنوی شروع ہوتی ہے۔

راہِ شب چوں مہرِ عالمتاب زد — گریۂ من بر رخِ گل آب زد
اشکِ من از چشمِ نرگس خواب شست — سبزہ از ہنگامہ ام بیدار رست
باغباں زورِ کلامم آزمود — مصرعے کارید و شمشیرے درود
در چمن جز دانۂ اشکم نکشت — تارِ افغانم بپودِ باغ رشت
ذرہ ام مہرِ منیر آنِ من است — صد سحر اندر گریبانِ من است
خاکِ من روشن تر از جامِ جم است — محرم از نا زادہائے عالم است
فکرم آں آہو سرِ فتراک بست — کو ہنوز از نیستی بیروں نجست

سبزہ نارُدئیدہ زیبِ گلشنم | گُل بشاخ اندر نہاں در دامنم
محفلِ رامشگری برہم زدم | زخمہ برتارِ رگِ عالم زدم
بسکہ عودِ فطرتم نادر نواست | ہم نشیں از نغمہ ام ناآشناست
در جہاں خورشید نو زائیدہ ام | رسم و آئینِ فلک نادیدہ ام
رم ندیدہ انجم از تابم ہنوز | ہست ناآشفتہ سیمابم ہنوز
بحر از رقصِ ضیایم بے نصیب | کوہ از رنگِ حنایم بے نصیب
خوگرِ من نیست چشمِ ہست و بود | لرزہ برتن خیزم از بیمِ نمود
بامم از خاور رسید و شب شکست | شبنمِ نو برگلِ عالم نشست
انتظارِ صبحِ خیزاں می کشم | اے خوشا زرتشتیانِ آتشم
نغمہ ام از زخمہ بے پرواستم | من نوائے شاعرِ فرداستم

میں مسلسل پڑھے چلا جا رہا تھا، اور دعوت میں آئے ہوئے حضرات ٹکٹکی باندھے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ اُن کے لئے یہ بات باعثِ حیرت تھی۔

اتنے میں ہمارے ایک دوست نے جنھیں کلامِ اقبال سے کوئی دلچسپی نہیں بلکہ اگر کہا جائے کہ وہ کلامِ اقبال کے ڈرین انسپکٹر ہیں تو بے جا نہ ہوگا کیونکہ انھیں اقبال کی شاعری میں معائب کے سوا کچھ نظر نہیں آتا، سامعین کی توجّہ کھانے کی طرف دلائی اور کہا کہ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے، آپ لوگ کیا اقبال کا کلام سُن رہے ہیں۔

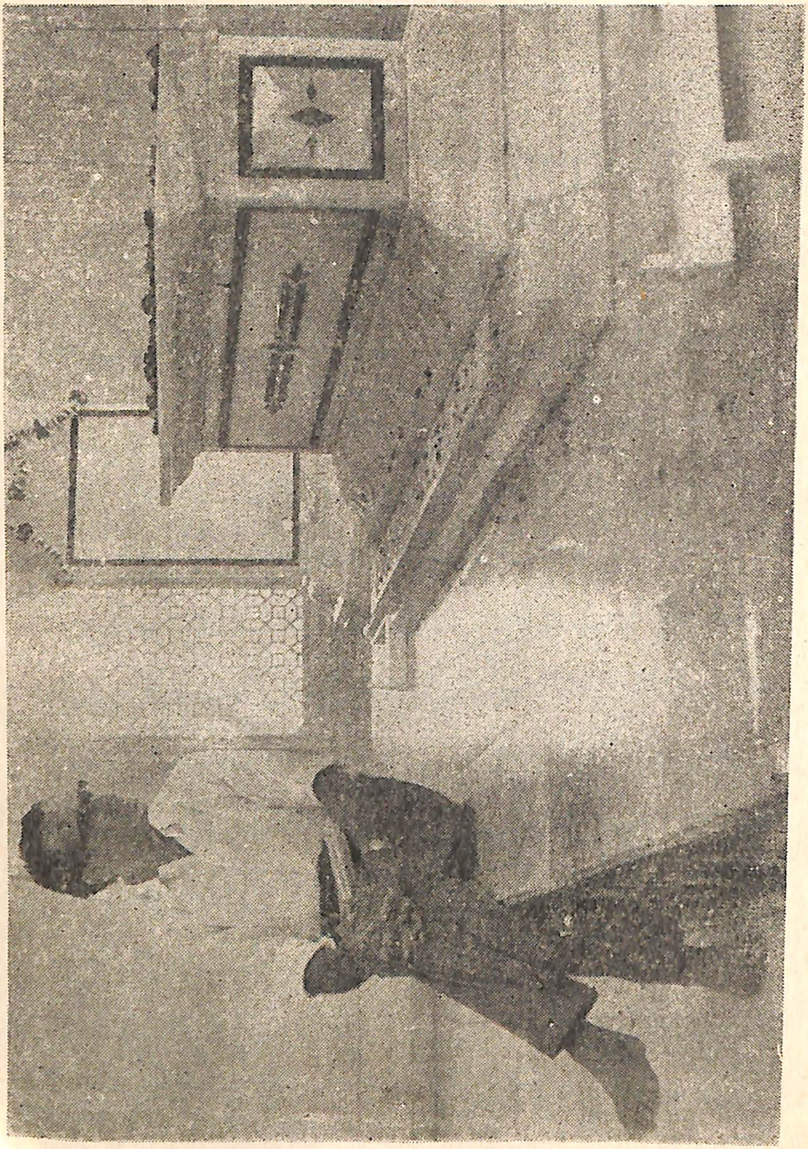
گورداس پور کا مشاعرہ ایک اہم مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ اس میں دُور دُور سے

شعرا تشریف لاتے تھے۔ معیاری کلام پیش کیا جاتا تھا۔ دو جگری دوست شفیع
اور محکم سنگھ سوفی اس مشاعرے کی رُوح رواں تھے۔ تقسیم ہند نے ان دونوں
کو ایک دوسرے سے جُدا کر دیا۔ محکم سنگھ سوفی تو آج بھی گورداسپور میں
مشاعروں کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہیں۔ شفیع سرور غالباً پاکستان جا چکے
تقسیم ہند کے بعد میں جب بھی پاکستان گیا میں نے اُن سے ملنے کی کوشش
لیکن یہ پتہ ہی نہ چل سکا کہ وہ گورداسپور چھوڑ کر پاکستان کے کس شہر میں آباد ہوئے
ہاں تو میں اقبال سے ملاقات کی خواہش کا ذکر کر رہا تھا۔ اس خواہش کا انجام
اقبال کے اس شعر پر ہوا ؎

گرمیٔ آرزو فراق شورشِ ہائے و ہُو فراق
موج کی جستجو فراق قطرہ کی آبرو فراق

اور ۲۱۔ اپریل ۱۹۳۸ء کو جب میں چند روز کے لئے راولپنڈی آیا ہوا تھا
کان میں آل انڈیا ریڈیو لاہور کی یہ آواز آئی کہ اقبال اس جہانِ فانی سے رحلت
فرما گئے ہیں۔

آج اقبال کی وفات کو چھبیس سال ہونے کو آئے ہیں۔ چوتھائی صدی سے
زیادہ مدت بیت چکی ہے لیکن اب بھی جب کبھی میں میکلوڈ روڈ سے گزرتا ہوں
مجھے یہی خیال آتا ہے کہ اگر مجھے یہ یقین دلا دیا جائے کہ اقبال اپنی کوٹھی کے برآمدے
میں موجود ہیں، ملاقاتیوں کا دربار لگا ہوا ہے تو کیا میں اُن کے دیدار کے لئے



اس کوٹھی میں جا سکوں گا۔ اس خیال کے آتے ہی میری ہمّت پست ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ اور میں تیزی سے قدم بڑھائے اس کوٹھی سے دُور نکل جاتا ہوں۔

حجاب اکسیر ہے آوارۂ کوئے محبّت کو
مری آتش کو بھڑکاتی ہے تیری دیر پیوندی

اسی میکلوڈ روڈ کے ساتھ ایک یاد اور بھی وابستہ ہے اور وہ یاد ہے مولٰینا ظفر علی خاں مرحوم کی یاد۔

مثلِ خورشیدِ سحر فکر کی تابانی میں
بات میں سادہ و آزادہ معانی میں دقیق

مولٰینا کو سب سے پہلے میں نے راولپنڈی کے ایک جلسے میں سُنا تھا۔ یہ غالباً ۱۹۳۸ء کا زمانہ تھا۔ مُسلم لیگ حصولِ پاکستان کے لئے نئی نئی میدان میں اُتری تھی۔ مولٰینا مجسّم خطابت کی تصویر بنے فصاحت و بلاغت کے دریا بہا رہے تھے۔ جلسے میں زیادہ تر مسلمان تھے۔ ہندو خال خال تھے۔ ایک مسلمان نوجوان نے ایک پرچے پر ایک سوال لکھّا اور مولٰینا کی خدمت میں پیش کر دیا۔ سوال کچھ اس قسم کا تھا "مجوّزہ پاکستان میں اقتصادی مسئلے کا آپ نے کوئی ذکر نہیں کیا۔ پاکستان اپنے فلاں فلاں اقتصادی مسائل کیسے حل کرے گا"؟ اس سوال کا مولٰینا نے جو جواب دیا وہ بڑی حد تک مضحکہ خیز تھا۔ حالانکہ ان مسائل کو پروفیسر برج نرائن ایم۔ اے، جو سناتن دھرم کالج میں اقتصادیات کے اُستاد تھے اور تحریکِ پاکستان

کے حامی تھے، اُپنے اکثر و بیشتر مقالات میں حل کر چکے تھے۔ ہندوؤں میں وہ اس لئے غیر ہر دلعزیز تھے کہ وہ اپنے مقالات میں پاکستان کے ہر اقتصادی مسئلے کا حل اور پاکستان کا روشن مستقبل پیش کرتے تھے۔ اگر وہ فسادات کے دنوں میں ایک جنونی مسلمان کے ہاتھوں قتل نہ ہو جاتے تو پاکستان کو عبدالقادر، غلام محمد، ممتاز حسن اور محمد شعیب کے پائے کا ایک ماہرِ اقتصادیات و مالیات مل جاتا۔ پروفیسر برج نرائن یقیناً پاکستان میں رہتے اور پاکستان کے اقتصادی مسائل اُسی خلوص سے حل کرتے جس خلوص سے وہ پاکستان کے حق میں مقالات لکھا کرتے تھے۔

ہاں تو مولٰینا نے اس نوجوان کو جو جواب دیا وہ جذباتی اعتبار سے بہت عمدہ سہی، عملی یا اقتصادی اعتبار سے خاصا پھُسپھُسا جواب تھا۔ مولٰینا نے کہا کہ مسلمان کے لئے اقتصادی مسائل کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ مسلمان کے سامنے روٹی کا مسئلہ کوئی مسئلہ نہیں۔ اس کے لئے مذہب سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔ وہ پیٹ پر پتھر باندھ کر سو سکتا ہے لیکن اپنے مذہب اور ایمان سے غافل نہیں ہو سکتا۔

یہ ایک حقیقت سہی کہ مسلمان مذہب کو روٹی پر ترجیح دیتا ہے لیکن ایک سیاسی جلسے میں جو قیامِ پاکستان کا جواز پیش کرنے کے لئے منعقد کیا گیا ہو، یہ جواب خاصا کھوکھلا ہے۔ لیکن مولٰینا کی شعلہ بیانی نے اس غیر منطقی جواب کو ایسی جِلا دی کہ فضا "مولانا ظفر علی خاں زندہ باد" "پاکستان زندہ باد" کے نعروں سے گونج اُٹھی۔

یہ ظفر علی خاں کی زندگی کا ایک پہلو تھا، دوسرا پہلو میری نظر میں اس سے زیادہ

اہم اور زیادہ تابناک تھا، اور وہ پہلو اُن کی زندگی کا ادیبانہ اور شاعرانہ پہلو تھا۔ آپ کہیں گے دونوں میں کیا فرق ہے؟ اُن کی ادبی زندگی اور سیاسی زندگی میں حدِ فاصل کہاں نظر آتی ہے؟ اُن کے ادبی نظریات سیاسی نظریات سے کہاں متصادم ہوتے ہیں؟ میرا جواب شاید آپ کو مطمئن نہ کر سکے۔ لیکن مجھے اپنے جواب سے اطمینان ہو جاتا ہے۔ اور وہ جواب ہے میرا نظریۂ فن۔ اُن کی سیاسی زندگی "ایک بُنوری کے معرکے تھے جو باقی نہ رہیں گے"، اور اُن کی شاعری "نغمۂ خسرو" ہے جو ہمیشہ "تازہ و شیریں" ہے۔

آج دُنیائے اُردو میں کون ہے جو اُن کی شاعری کا معترف نہیں۔ اور کون ہے جو اُن کے سارے کلام کا معترف ہو۔ مولٰینا کے کلام نے جہاں اُردو شاعری کو حدِّ نظر تک پھیلتی ہوئی وسعتیں اور فلک بوس بلندیاں عطا کی ہیں وہاں وقتی سیاست کی بدولت اس میں ایسی غلط اندیشیاں بھی راہ پا گئی ہیں جن کا متحمّل کسی زبان کا ادب العالیہ نہیں ہو سکتا۔ اعلیٰ شاعری سیاست سے متاثر تو ہو سکتی ہے، سیاسی اکھاڑہ نہیں بن سکتی۔ خواہ اس میں ڈانٹے کی سحر آفرینی یا مولٰینا ظفر علی خاں کا زورِ کلام ہی کیوں نہ کارفرما ہو۔ موضوع کوئی بھی ہو اُسے آفاقیت اُس وقت حاصل ہوگی جب اُس پر والمیک اور اقبال ایسے فن کاروں کی آفاق گیر نظریں پڑیں گی۔ یہ آفاقیت ظفر علی خاں کے کلام میں موجود ہے، لیکن ان کے کلام کے بیشتر حصّے میں اُسے تلاش نہیں کیا جا سکتا۔ آج اس بات کی بڑی ضرورت ہے کہ مولٰینا ظفر علی خاں کے کلام کا ایک انتخاب شائع کیا جائے تاکہ آنے والی نسلوں کی آنکھوں سے اس

نابغۂ عصر کی تصویر کے وہ خد و خال اوجھل نہ ہو جائیں جو اُردو ادب کے تصویر خانے کے لئے جاودانی فخر و مباہات کا باعث بن سکتے ہیں۔

یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ غالب اگر اپنا انتخاب شائع نہ کرتے اور چند سو اشعار کا یہ مجموعہ نسخۂ حمیدیہ یا نسخۂ عرشی میں جا بجا بکھرا ہوا ہوتا تو آج اُردو شاعری میں غالب کا کیا رتبہ ہوتا۔

قیامِ لاہور کے دوران میں "ادبی دُنیا" کا دفتر میرا ملجا و ماویٰ تھا۔ جہاں تک میری شاعری کا تعلق تھا مولٰنا صلاح الدین بات بات میں میرا دل بڑھایا کرتے تھے۔ میں کبھی کبھار ڈرتے ڈرتے اپنی غزل یا نظم مولٰنا یا میراجی کو دے دیا کرتا تھا، اور دوسرے مہینے جب اُسے "ادبی دنیا" کے اوراق میں دیکھتا تھا تو ناقابلِ بیان خوشی ہوتی تھی۔

اُس زمانے میں "ادبی دنیا" کے شاندار سالنامے نکلے۔ چغتائی کی تصویروں اور کرشن چندر کے افسانوں سے ان سالناموں کو چار چاند لگ جاتے تھے۔ ایک سالنامے کا تو دوسرا ایڈیشن بھی شائع ہوا۔ اور اس خوبصورتی کے ساتھ کہ اس میں کتابت یا طباعت کی ایک بھی غلطی نہیں تھی۔

حامد علی خاں، حفیظ ہوشیارپوری، کرشن چندر، دیوندر ستیارتھی اور اکثر نئے لکھنے والے "ادبی دنیا" کے دفتر میں اکثر جمع رہتے تھے۔ یہ میراجی کی شاعری کے عروج کا زمانہ تھا۔ ترقی پسند تحریک یا ترقی پسند ادب کے خد و خال ابھی تک

پوری طرح سے اُبھرے نہ تھے۔ میراجی، یوسف ظفر، منٹو اور کرشن چندر یہ سب نئے ادب کے عَلَم بردار تھے۔ "رجعت پسندی" اور "ترقی پسندی" کا فرق بعد میں جاکے واضح ہوا۔

"ادبی دُنیا" کا دفتر تو خیر ہم لوگوں کی نشست گاہ تھی ہی ویسے شاعروں اور ادیبوں کے اصلی ٹھکانے دوسرے تھے۔ عرب ہوٹل اور نگینہ بیکری۔ عرب ہوٹل اسلامیہ کالج کے سامنے ایک چھوٹا سا ہوٹل تھا۔ چراغ حسن حسرت، عبدالمجید بھٹی، اختر شیرانی، حمید نسیم، اور ہری چند رِند کی محفل یہاں گرم رہتی تھی۔ ہری چند رند چراغ حسن حسرت مرحوم کے شاگرد تھے۔ اس لئے زبان پر انھیں قابلِ رشک عبور حاصل تھا۔ چراغ حسن حسرت مرحوم بھی انھیں بہت عزیز رکھتے تھے۔ لیکن اُن کے لاُابالی پن سے بہت نالاں تھے۔ رند ایک بار غائب ہو جاتے تھے تو مہینوں صورت نہیں دکھاتے تھے۔ ایک دن میں نے حسرت مرحوم سے پوچھا، مولٰینا آج کل ہری چند کہاں ہے؟ کہنے لگے کسی انسان کے متعلق بات کرو۔

حسرت مرحوم ریاست پونچھ کے رہنے والے تھے۔ لیکن زبان پر اُن کو جو گہری نظر حاصل تھی وہ دہلی اور لکھنؤ والوں کے لئے باعثِ رشک و باعثِ حیرت تھی۔ ایک بار حمید نسیم نے اُن سے کہا، مولانا آپ کیا ہر وقت صحیح زبان کی بات کرتے رہتے ہیں۔ آپ تو ننانوے کے چکّر میں پڑے ہیں۔ حسرت صاحب نے فرمایا "بٹیا ننانوے کا پھیر ہوتا ہے چکّر نہیں ہوتا"

مجھے جب بھی موقع ملتا تھا میں اُن لوگوں کی باتیں سننے کے لئے اُن کی محفلوں

میں پہنچ جاتا تھا خود میں بات چیت میں زیادہ حصّہ نہیں لیتا تھا۔ اور ویسے بھی میرا حلقہ "ادبی دُنیا" کے دفتر کا حلقہ تھا۔ لیکن اُٹھنا بیٹھنا زیادہ تر نگینہ بیکری میں ہوتا تھا، عرب ہوٹل میں نہیں۔

اُسی زمانے میں حکومتِ پنجاب نے اُردو کا ایک اخبار نکالا "پنچائت" اور چراغ حسن حسرت اس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ پہلے شمارے کے صفحۂ اوّل کے لئے اُنھیں ایک نظم کی ضرورت تھی۔ مولینا صلاح الدین سے اُنھوں نے مشورہ کیا کہ اس موضوع پر نظم چاہیئے، کسی موزوں شاعر کا نام تجویز کریں۔ مولانا نے میرا نام تجویز کیا اور حسرت صاحب کا فیصلہ خود ہی مجھ تک پہنچا دیا۔

میرے لئے یہ پیش کش جہاں بڑی حد تک حوصلہ افزا تھی، وہاں حوصلہ شکن بھی تھی۔ اس لئے کہ لاہور میں ایک سے ایک اچھا شاعر موجود تھا۔ میں ظفر علی خاں، تاجور، حفیظ، ہری چند اختر یا احسان دانش کا ذکر نہیں کر رہا ہوں، خود ہم نوجوانوں یا لڑکوں میں بہت اچھا کہنے والے موجود تھے، اور صلاح الدین احمد اور چراغ حسن حسرت کی نگاہِ انتخاب مجھ پر پڑی تھی۔ یہ میرے لئے ایک امتحان تھا۔

میں نے نظم کہی۔ یہ نظم "پنچائت" کے صفحۂ اوّل پر چھپی۔ مجھے اس کا سات روپے معاوضہ ملا۔ اور میں اپنی اس دوہری کامیابی پر خوشی کے مارے پھولا نہ سمایا۔

اس نظم کی اشاعت کے بعد حسرت مرحوم کی خدمت میں میرا آنا جانا زیادہ ہو گیا۔ تقسیمِ ہند کے بعد ملاقاتوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ آخری ملاقات ان سے اُن کے

انتقال سے دو برس قبل کراچی میں ہوئی، جہاں میں ایک مشاعرے میں شرکت کے لئے گیا ہوا تھا۔ سید محمد جعفری مجھے کھانا کھلانے کے لئے فردوس ہوٹل میں لے آئے۔ وہاں حسرت صاحب موجود تھے۔ مجھ سے کہنے لگے "امروز" میں تمھاری کتاب پر میں نے تبصرہ کیا تھا۔ وہ تم نے دیکھا تھا؟ میں نے کہا جی ہاں "امروز" کے دفتر سے اس تبصرے کا تراشہ مجھے ملا تھا۔ اس کے ساتھ منسلکہ چھٹی میں تو یہ لکھا تھا کہ یہ تبصرہ فیض صاحب نے کیا ہے۔ کہنے لگے نہیں یہ تبصرہ فیض کا نہیں تھا میرا تھا۔ انھیں تبصروں میں بعض تبصرے فیض نے بھی کیے تھے۔ لیکن تمھاری کتاب پر تبصرہ میں نے کیا تھا، اور پھر اپنے تبصرے میں دو ایک فقروں کا حوالہ دے کر میرا حوصلہ بڑھایا۔ میں نے کہا مولینا آپ نے شروع ہی سے میری حوصلہ افزائی فرمائی ہے۔ میں ہمیشہ آپ کا شکر گزار رہوں گا۔ میں نے اپنی اس نظم کا ذکر کیا جو "پنچایت" کے صفحۂ اوّل پر مولینا نے شائع کی تھی۔ مولینا کو وہ زمانہ اچھی طرح یاد تھا، کہنے لگے ہاں اُس زمانے میں تمھاری کئی نظمیں "پنچایت" میں شائع ہوئی تھیں، اور اُن نظموں کی خوبی یہ ہوتی تھی کہ تم موضوع کا مطالعہ کر کے نظمیں کہتے تھے۔

شاعروں اور ادیبوں کی دوسری نشست گاہ نگینہ بیکری ہوا کرتی تھی۔ یہ نشست گاہ مولانا صلاح الدین احمد، ڈاکٹر سیّد محمد عبداللہ، عاشق بٹالوی اور باری علیگ کی آمد و رفت کا مرکز تھی۔ باری علیگ کی شخصیت لاہور کے ادبی حلقوں میں بڑی محبوب شخصیت تھی۔ اُن کی کتاب "کمپنی کی حکومت" اسی زمانہ میں مکتبۂ اُردو نے شائع کی تھی اور ہر زبان پر اس کتاب کا ذکر تھا۔ باری مرحوم جب باتیں کرتے تھے تو گویا اُن کے منہ سے پھول

جھڑتے تھے۔ بات چیت کے فن میں عاشق بٹالوی بھی اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ کبھی کبھی ان دونوں حضرات کی بات چیت کا رُخ یو، پی کی مخالفت سے ہوتا ہوا اہلِ زبان اور اُردو کی مخالفت تک جا پہنچتا تھا۔ اس ضمن میں باری صاحب کا یہ فقرہ مُدّتوں تک لاہور کی محفلوں میں گونجتا رہا کہ "یار جب ہم اُردو میں بات کہتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا جھوٹ بول رہے ہوں"! ابھی جب پچھلے دنوں میں انگلستان گیا اور وہاں عاشق صاحب سے ملاقاتیں ہوئیں تو نگینہ بیکری کا زمانہ گویا پھر سے واپس آگیا۔ کتنی ہی باتیں اور کتنے ہی واقعات ہم نے ایک دوسرے کو یاد دلا دلا کے ہنسایا اور ہنسا ہنسا کے رُلایا۔ اتفاق کی بات ہے کہ باری مرحوم کا یہ فقرہ دونوں کو یاد تھا، اور دونوں اس فقرے کو بار بار دُہرا کر دیر تک ہنستے رہے۔

اختر شیرانی مرحوم کبھی کبھار اس محفل میں آنکلتے تھے۔ ویسے اُن کا اصلی ٹھکانا عرب ہوٹل تھا، بلکہ اگر سچ پوچھیں تو اُن کا صحیح مستقر عرب ہوٹل بھی نہیں تھا۔ اُن کے ٹھکانوں کی داستان بالکل ہی ایک الگ داستان ہے۔ اور یہ داستان سنانے کا حق حکیم نیّر واسطی یا عاشق بٹالوی کو ہے۔ ہر کسی کو نہیں۔

اختر شیرانی سے میری ملاقاتیں زیادہ تر علّامہ تاجور کے دولت کدے پر ہوتی تھیں تھیں یا "شاہکار" کے دفتر میں۔ ایک مُدّت تک "شاہکار" کی ادارت بھی اختر صاحب ہی کے سپرد رہی۔

ایک دن کا ذکر ہے میں استادِ محترم مولٰینا تاجور کی خدمت میں حاضر ہُوا۔

کیا دیکھتا ہوں کہ مولینا اختر کو ڈانٹ رہے ہیں اور اختر شیرانی رو رہے ہیں۔ اُس وقت تو میں نہ سمجھا، لیکن بعد میں پتہ چلا کہ یہ جھوٹ مُوٹ کا رونا تھا۔

میں جب کمرے میں داخل ہوا تو مولینا مرحوم اور اختر کے درمیان یہ گفتگو ہو رہی تھی۔

غصّے کی آواز: "پھر کیا ہوا؟"

روتی آواز میں: "پھر میں نے بیوی کو مارا"

"پھر"

"پھر میں نے ماں کو گالیاں دیں"

"پھر؟ جلدی بتاؤ"

"پھر والد نے مجھے گھر سے نکال دیا"

اب مجھے تفصیل سے یاد نہیں کہ مولینا نے کیا کہا اور اختر نے کیا جواب دیا۔ لیکن اتنا یاد ہے کہ مولینا نے کہا۔

"اگرچہ میرے تعلّقات تمھارے والد کے ساتھ اچھے نہیں ہیں، لیکن اگر تم وعدہ کرو کہ اب بیوی کو نہیں مارو گے اور ماں کو گالیاں نہیں دو گے تو میں محمود شیرانی تک تمھاری سفارش کر سکتا ہوں۔ وہ میری بات نہیں ٹالیں گے"

"وعدہ کرتا ہوں"

"لیکن تم ایک شرابی ہو۔ تمھارے وعدے کا کیا بھروسہ"

اب اختر بالکل چپ ہو گئے۔ مولینا کہے سُنے چلے جا رہے ہیں اور اختر زمین جلند

نہ جنبد گُل محمد" بنے بیٹھے ہیں۔ آخر مولانا نے کہا۔

" میں یہ نہیں کہتا کہ تم شراب بالکل ترک کر دو۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم ایسے پیو جیسے انگریز پیتا ہے۔ اور پھر تم ایک اصول اور بنا لو وہ یہ کہ ایک تو انگریزی شراب پیو اور جب پیو اپنے پیسے سے پیو"

اب اختر صاحب سے خاموش نہ رہا گیا۔ فوراً بول اُٹھے۔

" مولانا اس کا مطلب تو یہ ہے کہ میں پینا یک قلم ترک کر دوں۔ اچھا میں عہد کرتا ہوں کہ آج نہیں پیوں گا!"

سہ پہر ہو چلی تھی۔ مولانا نے چائے کے لئے ملازم سے کہا۔ چائے آئی تو اختر نے اجازت چاہی اور کہا کہ مولانا ہم دونوں کو اجازت دیجیے، میری اور آزاد کی چائے ایک اور جگہ ہے"

مولانا بولے میں سب سمجھتا ہوں۔ لیکن تم اس کو کیوں اپنے ساتھ لئے جاتے ہو۔ اسے بھی خراب کرو گے۔ یہ تو ابھی آیا ہے اسے بیٹھنے دو۔ لیکن اختر مجھے زبردستی اُٹھا کر اپنے ساتھ لے گئے۔

اختر نے یہ چائے کے بارے میں بالکل گپ ہانکی تھی۔ میری اور اُن کی کہیں بھی چائے کی دعوت نہیں تھی۔ اصل میں میرا اور اُن کا کہیں اکٹھا آنا جانا بھی نہیں تھا۔ اس لئے کہ ہم دونوں میں ایک طرح سے خوردی و بزرگی کا رشتہ تھا۔ عمر کا کچھ نہ کچھ فرق تو ضرور تھا، لیکن اختر مجھ سے ایسا برتاؤ کرتے تھے جیسے میں بالکل ہی بچہ ہوں۔

اُن کے گھر میں جانے کا اتفاق مجھے اکثر ہوا، لیکن مجھے بالکل یاد نہیں کہ میں نے انھیں کبھی شراب پیتے ہوئے دیکھا ہو۔ وہ جب شغلِ نائے و نوش کرنا چاہتے تھے تو مجھے وہ اپنے گھر سے بھگا دیتے تھے۔ بالعموم اُن کا فقرہ یہ ہوتا تھا "جاؤ اب تم بھاگ جاؤ"۔

اصل میں وہ اپنی عادت سے مجبور تھے۔ شراب کے بغیر رہ نہیں سکتے تھے لیکن اسے اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ اس لیئے اُن کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ کسی اور کو جو اس عادت میں مبتلا نہیں ہے اس کی ترغیب نہ دیں۔ جہاں تک میرا علم ہے اُنھوں نے کسی نہ پینے والے کو پینا نہیں سکھایا۔

اب جو یہ مجھے اپنے ساتھ نیچے لے کے آئے تو کہنے لگے ایک تو مجھے سگریٹ کی ڈبیہ لے دو اور دوسرا اس تانگے والے کو مستی گیٹ تک کا کرایہ دے دو۔ میں نے کہا بھائی جان سگریٹ کی ایک نہیں جتنی ڈبیاں آپ چاہیں لے لیں، لیکن یہ مستی گیٹ تک کرائے والی بات غلط ہے۔ میں جانتا ہوں آپ مستی گیٹ اس لئے جانا چاہتے ہیں کہ وہاں جاکر شراب پئیں۔ ابھی آپ نے مولینا سے وعدہ کیا ہے کہ آج آپ شراب نہیں پئیں گے۔ اگر آپ مستی گیٹ کا رُخ کریں گے تو میں ابھی جا کے مولینا کو بتا دوں گا۔ اُنھوں نے پہلے تو مجھے پیار سے سمجھایا، جب میں نہ مانا تو ڈانٹ کے کہا کہ فوراً تانگے والے کو کرایہ دے دو اور سگریٹ کی صرف ایک ڈبیہ لے دو۔ زیادہ مجھے نہیں چاہیئے۔ میں سہم گیا اور فوراً حکم کی تعمیل کی۔

دوسرے دن میں نے "ادبی دنیا" کے دفتر میں یہ واقعہ صلاح الدین احمد کو

عاشق بٹالوی کو سنایا۔ عاشق صاحب نے کہا کہ آج صبح ہی ہمیں پتہ چلا کہ کل رات مستی گیٹ کے شراب خانے میں اختر صاحب نے پہلے تو اپنا کوٹ گروی رکھا۔ پھر قمیص مے خانے والوں حوالے کی اور آدھی رات کو صرف ایک شلوار پہنے ہوئے نشے میں مست حکیم نیّر واسطی کے وہاں پہنچے۔

نیّر واسطی اختر کے جاں نثار دوستوں میں سے تھے۔ ہر مشکل وقت میں اُن کے کام آتے تھے، اور جب اختر شراب خانوں میں جُبّہ و دستار رہن رکھ کر باہر آتے تھے تو حکیم نیّر واسطی کے گھر کے سوا انھیں کوئی سہارا نظر نہیں آتا تھا۔

یہ زمانہ احسان دانش کے عروج کا زمانہ تھا۔ اُن کا کلام اور اُن کی آواز دونوں اپنے جوبن پر تھے۔ جنگی مشاعرے ملک کے گوشے گوشے میں ہو رہے تھے اور احسان کی شہرت خوبیٔ کلام کے علاوہ ان مشاعروں کی بدولت بھی مُلک میں چاروں طرف پھیل رہی تھی۔

احسان گیلانی پریس بک ڈپو میں ملازم تھے۔ ہسپتال روڈ پر یہ بک ڈپو تھا۔ ایک روز میں وہاں بیٹھا تھا کہ کسی گاہک نے آکر پوچھا، آپ کے پاس پریم چند کا ناول "غبن" ہے؟ احسان نے کہا "نہیں ہے" وہ شخص چلا گیا تو میں نے احسان سے کہا کہ یہ کیا مسخرہ پن ہے۔ وہ سامنے دیکھیے "غبن" کی کئی جلدیں رکھی ہیں۔ احسان نے کہا اگر کتاب بیچ دیں تو پھر دُکان میں کیا رہے گا۔ غرض اس طرح احسان دانش گیلانی بک ڈپو چلاتے رہے۔ اس کے بعد انھوں نے یونی ورسٹی روڈ پر اپنی دُکان

کھول لی۔ ساتھ ہی آپ نے اپنی کتابیں چھاپنا شروع کر دیں اور آہستہ آہستہ اپنے کام کو فروغ دیتے چلے گئے۔

آج ایبک روڈ پر احسان کی بہت بڑی کتابوں کی دُکان ہے۔ اپنے کاروبار کے سلسلے میں احسان نے جس استقامت اور ثابت قدمی کا ثبوت دیا ہے وہ اُردو کے شاعروں اور ادیبوں کے لئے ایک درسِ حیات سے کم نہیں۔

احسان اُس زمانے میں کہا کرتے تھے کہ بورئیے پر میری آنکھ کُھلی ہے قالین پر دم نکلے گا۔ کسی نے سوال کیا، احسان صاحب بورئیے اور قالین میں کیا فرق ہے؟ کہنے لگے "بال کا"۔

حلقۂ اربابِ ذوق اور حلقۂ اربابِ علم کا قیام اسی زمانے کی یادگار ہے۔ یہ وہی دو حلقے ہیں جن کے بارے میں سالک مرحوم نے ایک بار کہا تھا، "لاہور میں دو ادبی حلقے ہیں ایک حلقۂ اربابِ ذوق، جس میں علم کی کمی ہے اور دوسرا حلقۂ اربابِ علم جس میں ذوق کی کمی ہے۔"

کالج سے میں نکلا تو بے کاری استقبال کے لئے موجود تھی۔ وقار انبالوی سے میں نے مشورہ کیا کہ کیا کیا جائے؟ طے پایا کہ کسی روزنامہ اخبار میں پارٹ ٹائم نوکری کر لی جائے اور ایم۔ اے میں داخلہ لے لیا جائے۔ خیال یہ تھا کہ تیس روپے تنخواہ مل جائے تو کام چل جائے گا، چنانچہ ہم دونوں "ملاپ" اخبار کے مالک رنبیر جی کے وہاں پہنچے، اُنھوں نے تھوڑی دیر بات چیت کے بعد خود ہی چالیس روپے ماہانہ

کی پیش کش کر دی۔ وقار نے چھوٹتے ہی کہا یہ تو تیس روپے کی توقع پر آیا تھا۔ رنبیر جی بولے تنخواہ تو اب بھی تیس ہی ہے۔ دس روپے مزید اس لیے ہیں کہ میں اِن سے رُباعیاتِ عمر خیّام پڑھوں گا۔ لیکن جب تک میں "ملاپ" میں رہا رنبیر جی کو رُباعیاتِ عمر خیّام مجھ سے پڑھنے کی فرصت ہی نہ ملی۔ خود اُن کا ادبی ذوق نکھرا ہوا ہے۔ رُباعیاتِ عمر خیّام انھوں نے ضرور پڑھ لی ہوں گی، لیکن از خود اور اپنے اوقاتِ فرصت میں۔

مگر یہ سلسلہ زیادہ دیر نہ چل سکا، چنانچہ ایم۔ اے میں داخلہ لینے کے بعد میں "ملاپ" کی نوکری سے مستعفی ہو گیا۔ لیکن "ملاپ" اور رنبیر جی اور اس خاندان کے دوسرے افراد کے ساتھ جو رشتۂ مودّت اُس وقت قائم ہوا تھا وہ ہمیشہ استوار رہا اور آج بھی برقرار ہے۔

ایم۔ اے میں نے جن اساتذہ کے سامنے زانوے ادب تہ کیا اُن میں ڈاکٹر محمد اقبال (وائس پرنسپل اورنٹیل کالج) سیّد عابد علی، صوفی غلام مصطفےٰ تبسّم اور ڈاکٹر سیّد محمد عبد اللہ ایسے نام ہیں جن سے اکتسابِ فیض کی تمنّا ایم۔ اے کا امتحان دینے کے بعد بھی دل میں باقی رہی اور حسرت بن کر یہ تمنّا ابھی تک دل میں موجود ہے۔

انھیں دنوں پنجاب میں سر سکندر حیات مرحوم نے ہندو مسلم اتّحاد کے لئے تحریکِ رفاقت کے نام سے ایک تحریک جاری کی تھی۔ میں تعلیم سے فارغ ہوا تو اس تحریک میں شامل ہو گیا، اور پنجاب کے گوشے گوشے میں تحریک کی جانب سے ہندو مسلم اتّحاد کی تلقین کرتا پھرا، لیکن حالات کچھ ایسے تھے کہ یہ تحریک پنجاب میں روز افزوں فرقہ وارانہ

کشیدگی کا مقابلہ نہ کر سکی اور آخر کار کارکنوں کے عزم اور جوش و خروش کے باوجود اُس نے فرقہ واری کے متعفن ماحول میں دم توڑ دیا۔

اس کے بعد میں پنجاب کے کانگریسی اخبار "جے ہند" سے وابستہ ہو گیا اور اگست ۱۹۴۷ء تک وہیں کام کرتا رہا۔ تقسیم کے بعد ہجرت کے سیلاب میں بہتا بہتا ہزاروں لاکھوں ہم وطنوں کے ساتھ لاہور سے دہلی آگیا۔ لاہور سے دہلی تک کا سفر ایک الگ اور طویل داستان ہے۔ جس کی یہاں نہ تو ضرورت ہے اور نہ گنجائش۔ ہاں میری شاعری میں یہ کہانی اوّل سے آخر تک موجود ہے۔

لاہور کا ذکر اس داستان میں ذرا زیادہ ہی ہو گیا ہے۔ ع

لذیذ بُود حکایت دراز تر گفتم

اصل میں میں نے اِس ذکر کو کئی جگہوں پر ختم کرنے کی کوشش کی، لیکن کسی نامعلوم جذبے کے تحت یہ شعوری کوشش ہمیشہ ناکام رہی۔ لاہور میری منزل بھی ہے اور میرا جادۂ منزل بھی، اور اگر منزل پر پہنچ جانے والے مُسافر جادۂ منزل پر سرگرم سفر رہنے کی لذت سے ذرا بھی آشنا ہو جائیں تو اپنی آوارگیٔ منزل کو منزل رسیدگی پر ہزار بار ترجیح دیں۔

ع نہ پوچھو مجھ سے لذّت خانماں برباد رہنے کی

میں ابھی تک اس گتھی کو نہیں سُلجھا سکا کہ ۱۹۳۷ء میں میں لاہور میں آیا یا لاہور میری زندگی میں داخل ہوا۔ آخر راولپنڈی بھی ایک شہر تھا، جہاں میرا لڑکپن بسر ہوا۔ اس کے بعد دہلی میں بھی مُدّت سے قیام ہے۔ لیکن لاہور میں ایسی کیا بات تھی کہ

یہ شہر میرے لئے

بسیار خوباں دیدہ ام لیکن تو چیزے دیگری

کی تصویر بن گیا ہے۔ کیا اس کا سبب وہ دو ایک جذباتی حادثے تو نہیں جو زندگی میں ایک بار نشوونما ہوتے ہیں تو ہمیشہ کے لئے اپنی یاد چھوڑ جاتے ہیں۔ جب اس پر غور کرتا ہوں تو وہ حادثے آج بڑی مشکل سے یاد آتے ہیں۔ اُن کے تو اب دُھندلے نقوش بھی باقی نہیں رہے۔ ہاں لاہور خود ایک ایسا حادثہ بن گیا ہے کہ اس کا تصوّر اور حادثے کا یہ موضوع دونوں ساتھ ہی ساتھ ذہن میں آتے ہیں۔

آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

لاہور کے بعد کئی شہر راستے میں آئے۔ سری نگر، لکھنؤ اور حیدرآباد (اور یہ دہلی بھی) بھلائے یہ بھی نہیں جا سکتے۔ سری نگر کی برقِ تجلّی مشرقِ وسطیٰ میں بھی چمکی اور یورپ میں بھی۔ شاعروں کی آنکھیں بھی چندھیائیں اور محققّین کی بھی۔ آج یہ شہر ایک محملِ بے لیلیٰ سہی، یادوں کے نقوش اس فضا میں آج بھی جگمگا رہے ہیں۔

دہلی میں میرا قیام ہے، اور گویم مشکل و گرنہ گویم مشکل والا معاملہ ہے۔ لکھنؤ کی کہانی رفت و گزشت ہو چکی، اور ان سب کے بعد اس بلدہ مینو سواد، حیدرآباد کا نام آتا ہے جس کی راہ میں لاہور بھی حائل نہیں ہو سکا۔

در دلم را اگر کاوی خیالِ خویش را یابی
پریشاں جلوہ چوں ماہتاب اندر بیابانے

اقبال کا یہ شعر داستانِ حیدرآباد کی ابتدا بھی ہے اور انتہا بھی اور اس سے زیادہ کہنے کی مجھے مجال ہے نہ تاب۔

اگر یک سرِ موئے برتر پرم
فروغِ تجلّی بسوزد پرم

لاہور سے جُدائی کی داستان بظاہر بہت طویل سہی، لیکن دراصل بہت مختصر ہے۔ معلوم تو یہ ہوتا ہے کہ جب تک نفسِ جبرئیل حاصل نہ ہو یہ حرفِ راز کہا ہی نہیں جا سکتا۔ لیکن بات صرف اتنی ہے کہ ع

شعلہ بودیم شکستیم شرر گردیدیم

۹ ستمبر کی رات سرحد کے اُس پار تھی اور ۱۰ ستمبر کی رات اِس پار۔ اس ذرا سی بات کے لئے اتنا محشر برپا ہو گیا۔

دہلی پہنچ کر اس مصرعے کا مفہوم سمجھ میں آیا۔ ع

ایک چکّر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

اور یہ چکّر زیادہ تر کناٹ پلیس کے گھیرے تک محدود رہا۔ اِس چکّر میں دیوندر ستیارتھی، اور ساحر لدھیانوی سے اکثر آمنا سامنا ہوا۔ لیکن کسی کو اپنی منزل معلوم نہ تھی۔ بانگِ جرس بھی تو نہیں آ رہی تھی۔

لاہور سے جدائی کی تلافی دہلی نے بڑی حد تک کی، لیکن بات نہ بن سکی۔ لڑکپن کا وہ دَور واپس نہ آ سکا، جب ہم چند دوست رات کو مشاعرے کے بعد ماڈل ٹاؤن

سے پیدل چل کھڑے ہوتے تھے اور پَو پھٹنے سے پہلے لاہور پہنچ جاتے تھے اور اگر تھک گئے تو رستے میں نہر کے پُل پر سو جاتے تھے۔

دہلی بہت بڑا شہر تھا، اب اور بڑا ہو گیا ہے۔ اس میں لاہور کا "سمٹا سمٹایا پن" نظر نہ آیا تو ایک وحشت سی ہونے لگی۔ اتنے بڑے شہر میں کوئی کیسے رہے۔ ایک دن پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر دیوان آنند کمار کی خدمت میں حاضر تھا۔ لاہور کی بات ہو رہی تھی۔ میں نے عرض کیا کہ ہندوستان میں آ کر بڑے بڑے شہر دیکھے۔ بمبئی، کلکتہ، مدراس، کان پور، لیکن لاہور کا جواب کہیں نظر نہیں آیا۔ کہنے لگے تم بمبئی کلکتہ کی بات کرتے ہو میں سارا یورپ اور انگلستان گھوم آیا ہوں مجھے وہاں لاہور کا جواب نظر نہیں آیا۔

اس پر مجھے ایک لطیفہ (یا واقعہ) یاد آ گیا۔ لاہور ہی کی بات ہے، آل انڈیا ریڈیو کے آرٹسٹ 'سلطان' پنڈت ہری چند اختر مرحوم کے سامنے کسی عورت کے حُسن کی تعریف کر رہے تھے اور اپنی بات اُنھوں نے اس جملے پر ختم کی۔ پنڈت جی ایسی حسین عورت دنیا کیا، ایشیا کیا، ہندوستان کیا، پنجاب کیا، لاہور میں نہیں ملے گی۔

میں اس لاہور کے بارے میں اپنے تاثرات نور جہاں کے اس شعر میں تو پیش نہیں کر سکتا

لاہور را بہ جان برابر خریدہ ایم
جاں دادہ ایم و جنّتِ دیگر خریدہ ایم

لیکن اپنے تاثرات کے اظہار کے لئے اقبال کا یہ شعر ضرور پیش کر سکتا ہوں۔

کبھی چھوڑی ہوئی منزل بھی یاد آتی ہے راہی کو

کھٹک سی ہے جو سینے میں غمِ منزل نہ بن جائے

حالات کے تحت میں خود تو دہلی آگیا، لیکن میرا دل لاہور ہیں رہا۔ مدّتوں تک ایسا رہا کہ پارلیمنٹ اسٹریٹ کی بجائے مال روڈ کا نام زبان پر آیا۔ چاندنی چوک کا لفظ بڑی مشکل سے زبان پر چڑھا۔ بلا ارادہ جو نام زبان پر آتا تھا وہ "انار کلی" تھا۔ بات "جمنا" کی ہوتی تھی تو زبان پر لفظ "راوی" کا ہوتا تھا۔

لاہور سے دہلی تک کا سفر نہ جانے کتنے دنوں میں طے ہوا تھا۔ اپنی منزل کا تو مجھے کچھ علم ہی نہیں تھا۔ تین چار دن کے بعد دہلی آکر جب ریل رُکی تو پتہ چلا کہ یہ ریل اب آگے نہیں جائے گی۔ چنانچہ میں خالی ہاتھ، خالی دل پلیٹ فارم سے باہر آیا اور لوگوں سے پتہ پوچھتا منوّر لکھنوی کے مکان پر جا پہنچا۔ منوّر صاحب گھر پر نہیں تھے۔ میں اُن کے انتظار میں بیٹھ گیا۔ تھکا ہوا تو تھا ہی نیند آگئی۔ رات کو منوّر صاحب آئے تو اُنھوں نے مجھے جگایا۔ میری روداد سُنی، ہم لوگوں نے کھانا کھایا اور دوسرے دن سے میری زندگی کا ایک نیا دَور شروع ہوا۔

منوّر صاحب کا مکان بُلبلی خانے میں تھا، جو مسلم اکثریت کا محلہ تھا۔ اس محلّے میں ہندو مسلمان شِیر و شکر ہو کر زندگی بسر کر رہے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ اطلاع مسلمانوں تک پہنچی کہ لاہور سے ایک "شرنارتھی" آیا ہے اور منوّر صاحب کے گھر میں مقیم ہے۔ مسلمان

اس اطلاع سے بہت گھبرائے۔ کیوں کہ اُنھیں اندیشہ تھا کہ لاہور سے آنے والا ہندو شرنارتھی اس محلّے کے مسلمانوں کے لئے کوئی نہ کوئی خرابی پیدا کرے گا۔ چنانچہ انھوں نے منوّر صاحب سے کہا کہ وہ محلّے کے امن وامان پر رحم کریں اور اس شرنارتھی کو اپنے گھر سے نکال دیں۔ منوّر صاحب نے اگرچہ میری وکالت کی اور کہا کہ اس شرنارتھی سے ایسا کوئی خطرہ نہیں ہے، لیکن مسلمان اُن کے جواب سے مطمئن نہ ہوئے۔ چنانچہ منوّر صاحب نے چند روز بعد میرے لیے ایک اور ٹھکانہ ڈھونڈا اور مجھے اس نئے ٹھکانے میں پہنچا آئے۔

یہ عرش ملسیانی کا مکان تھا۔ میں جب وہاں پہنچا تو پنڈت ہری چند اختر اور عرش لان میں بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر دونوں نے زوردار قہقہہ لگایا۔ اور کہنے لگے "آجاؤ ہم تمھارا انتظار ہی کر رہے تھے"۔ میں حیران تھا کہ یاالٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ انھیں مجھے اس کس مپرسی کے عالم میں یہاں دیکھ کر نہ حیرت ہوئی نہ انھوں نے میری رُوداد سننے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ اس بے تکلّفی سے انھوں نے مجھے "آجاؤ" کہا ہے جیسے ہندوستان اور پاکستان میں کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

میں اُن کے قریب پہنچا تو عرش نے کہا بیٹھو اور پھر تاش میں مگن ہو گئے۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا میں نے کہا آپ دونوں کو کیا ہو گیا ہے۔ آپ مجھ سے پوچھتے کیوں نہیں کہ میں یہاں کب آیا، کب لاہور سے چلا۔ لاہور اور امرت سر میں انسانوں پر کیا گزر رہی ہے۔ اختر کہنے لگے ہمیں سب معلوم ہے، تم ہاتھ منہ دھولو اور

چائے پیو، اور پھر دونوں تاش میں محو ہو گئے۔

قتل و غارت کے واقعات کی خبریں سننا ایک روزمرّہ کا معمول بن گیا تھا۔ لاکھوں افراد لُٹ لُٹا کر اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر آ جا رہے تھے۔ میرے لاہور سے چلے آنے پر کوئی کیوں حیرت کا اظہار کرتا۔

اب میرے سامنے دو مسئلے تھے۔ ایک تو یہ کہ والدین اور بچّے راولپنڈی سے کیسے دہلی پہنچیں گے، دوسرا اپنے روزگار کا مسئلہ۔ اس آخرالذکر مسئلے کے تو حل ہونے میں دیر نہ لگی۔ کناٹ پلیس ہی میں ایک دن رنبیر جی سے آمنا سامنا ہو گیا۔ اُسی لاہور والی شگفتگی اور بے تکلّفی سے کہنے لگے "نوکری کرو گے؟" میں نے کہا جی ہاں کروں گا"۔ کہنے لگے "کل سے دفتر آنا شروع کر دو"۔ چنانچہ دوسرے دن سے "ملاپ" کا دفتر میرا دفتر بھی بن گیا اور گھر بھی۔ دن میں اپنا کام ختم کرنے کے بعد رات کو میں وہیں سو جاتا تھا۔ صرف میں ہی کیا "ملاپ" کا قریباً سارا عملہ وہیں سو جاتا تھا۔ یہ صورتِ حال چند ماہ تک رہی۔ اس کے بعد عرش ملسیانی نے مجھ سے منسٹری آف لیبر کے دفتر میں درخواست دلوا دی اور مجھے وہاں جگہ مل گئی۔

والدین اور بچّوں کے راولپنڈی سے دہلی آنے کا مسئلہ کافی مدّت تک پریشانی کا باعث رہا۔ آخر وہ علی گڑھ کے ایک اولڈ بوائے کپتان عبدالمجید کی امداد کے سہارے راولپنڈی سے جالندھر پہنچے۔ کپتان عبدالمجید خدا جانے اس وقت کہاں ہیں لیکن جہاں بھی ہوں گے اپنی شرافت اور اعلیٰ کردار کی بدولت

اپنا، اپنے خاندان اور اپنے مُلک کا نام بلند کر رہے ہوں گے۔ اللہ اُن کی آبرو ہمیشہ محفوظ رکھے!

منسٹری آف لیبر میں کام کرتے ہوئے مجھے ابھی چند ہی مہینے ہوئے تھے کہ پبلیکیشنز ڈویژن کے نائب مُدیروں کی تین آسامیاں خالی ہوئیں۔ مُدیر کی تنخواہ تو اتنی زیادہ تھی کہ درخواست دینے کا مجھے حوصلہ ہی نہ ہوا۔ نائب مُدیر کی جگہ کے لئے میں نے درخواست دے دی۔ کچھ مُدّت بعد انٹرویو ہوا اور عرش ملسیانی میں اور بلونت سنگھ ان اسامیوں کے لئے منتخب ہو گئے۔ چند روز بعد مُدیر کا انتخاب عمل میں آیا، اور اس عہدے پر حضرت جوش ملیح آبادی کا تقرر ہوا۔

پبلیکیشنز ڈویژن کے شعبۂ اُردو میں تین ماہانہ جریدے تھے: "آج کل" "بساطِ عالم" اور "نونہال" تقسیمِ کار کا سوال پیدا ہوا تو "آج کل" کا کام عرش ملسیانی کے سپرد ہوا۔ "بساطِ عالم" میرے حصّے میں آیا اور "نونہال" بلونت سنگھ کے حوالے ہوا۔ کچھ مُدّت بعد پنڈت ہری چند اختر بھی اس زمرے میں آ کر شریک ہوئے۔ ایک پندرہ روزہ جریدے کا اضافہ ہوا، اور اُس کی ادارت اختر صاحب کے سپرد ہوئی۔

۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۵ء تک کا زمانہ ادبی اعتبار سے میرے لئے ایک اہم زمانہ ہے۔ اس دَور میں جوش ملیح آبادی کی رفاقت بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ انھوں نے ہمیں یعنی اپنے رفقائے کار کو صرف اپنے کلام ہی سے نہیں نوازا بلکہ ہماری زبان

پر بھی کڑی نظر رکھی ۔ اُردو کی باریکیوں سے آشنا کیا۔ فارسی شاعری کے اعلیٰ ترین نمونوں سے آگاہی بہم پہنچائی۔ باتیں کیں، لطیفے سُنائے، اور یہ آٹھ سال کی مُدّت یوں گزر گئی جیسے ع

جھونکا نسیم کا اِدھر آیا اُدھر گیا

اصل میں یہ موضوع ایک الگ مقالے کا متقاضی ہے۔ جوش کے ساتھ اِس قدر طویل رفاقت اور وہ بھی شب و روز کی رفاقت زیرِ تحریر مقالے کا ضمیمہ یا جزو نہیں بنائی جا سکتی۔ کیوں کہ ع

ایں نہ بحریست کہ پایاں و کنارے دارد

جوش کے دم سے پبلیکیشنز ڈویژن کا شعبۂ اُردو ہی نہیں بلکہ ساری دِلّی باغ و بہار بنی ہوئی تھی۔ جوش دلّی سے چلے گئے تو صورت یہ تھی کہ ع

تم کیا گئے کہ بیت گئے دن بہار کے

جوش کی شخصیت میں جو دلکشی میں نے دیکھی وہ مجھے اور کسی شاعر میں نظر نہیں آئی۔

۱۹۴۷ء کے آخر یا ۱۹۴۸ء کے شروع میں میں پہلی بار پاکستان واپس گیا۔ لائل پور میں مشاعرہ تھا۔ ہندوستان سے تین شعراء کو دعوت دی گئی تھی۔ غالباً منتظمینِ مشاعرہ تین مختلف اسکولوں کے شعراء کو مدعو کرنا چاہتے تھے۔ ایک تھے حضرت نوح ناروی، دوسرے حضرت جگر مرادآبادی اور تیسرے مَیں۔ اتفاق سے

نوح صاحب اور جگر صاحب کے ساتھ دہلی ہی میں لائل پور کے مشاعرے سے چند روز قبل ملاقات ہوگئی۔ میں نے جگر صاحب سے لائل پور جانے کے بارے میں پوچھا، بولے "کیسے جاسکتے ہیں" یہی جواب نوح صاحب کا تھا۔ میں اب تنہا رہ گیا تھا۔ لاہور کی خاک کو ایک بار دیکھ لینے کے لیۓ میں تڑپ رہا تھا۔ چنانچہ اگرچہ گھر کے لوگوں نے حامی نہیں بھری، اور احباب نے بھی ان حالات میں لاہور نہ جانے کا مشورہ دیا۔ لیکن میں سب کو کسی نہ کسی طرح سے راضی کر کے ایک بار پھر لاہور جا پہنچا۔ میری نظم ع "تری بزمِ طرب میں سوزِ پنہاں لے کے آیا ہوں" اُسی زمانے کی یادگار ہے۔ اس کے بعد مشاعروں کے سلسلے میں مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان جانے کا اتفاق کئی بار ہوا۔ بعض دفعہ تو سال میں تین تین چار چار چکر بھی لگے۔ لیکن ہر بار جا کر تشنگی بڑھتی ہی رہی۔ یوں تو میرا سارا کلام انہی تاثرات سے لبریز ہے۔ لیکن طویل نظم "وطن میں اجنبی" کا پس منظر خاص طور سے یہی ہے۔ اس نظم کی تشکیل میں لاہور اور راولپنڈی سے میرا احساسِ جدائی ہی کارفرما نہیں ہے، بلکہ اس پذیرائی اور محبت کا ردِ عمل بھی جاری و ساری ہے جس کا احساس مجھے مغربی اور مشرقی پاکستان کے مختلف شہروں میں متعدد بار جا کر ہوا۔ یہ شہر صرف لاہور اور راولپنڈی ہی نہیں، بلکہ کراچی، مُلتان، لائل پور اور جوہر آباد کے علاوہ مشرقی پاکستان کے بعض ایسے شہر مثلاً ڈھاکہ، نرائن گنج، چٹاگانگ اور کُھلنا وغیرہ بھی

اس فہرست میں شامل ہیں۔ جن کے ساتھ تقسیمِ ہند سے قبل میرا کوئی تعلّق نہیں تھا۔

ہندوستان کی تقسیم نے اگرچہ ہم ہندوستانیوں کی ایک قوم کی تھیوری پر کاری ضرب لگائی ہے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس سیاسی تقسیم کے باوجود دو چیزیں تقسیم نہیں ہو سکیں۔ ایک اُردو اور دوسرا وہ جذبۂ محبّت جو سیاسی ہنگامہ آرائی کے باوجود ہندوستانی شعراء کو پاکستان اور پاکستانی شعراء کو ہندوستان لے آتا ہے۔

یوں تو میرے ہر سفرِ پاکستان نے مجھے اس بات کا یقین دلایا ہے کہ مُجھے اس محبّت کا بہت بڑا حصّہ ملا ہے، لیکن بعض مشاعرے تو میری زندگی میں اس طرح یادگار بن کے رہ گئے ہیں کہ میں اپنی داستانِ حیات کو ان مشاعروں سے الگ کر کے دیکھ ہی نہیں سکتا۔

ان مشاعروں کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں۔ اس لئے کہ یہ مقالہ مشاعروں کی ختم نہ ہونے والی داستانوں کا متحمّل نہ ہو سکے گا لیکن ہر مشاعرے سے میں ہمیشہ یہ تأثر لے کر آیا کہ تقسیم کے باوجود کوئی نہ کوئی رشتۂ مودّت ایسا ہے جو اِن دونوں ملکوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مضبوطی سے وابستہ کئے ہوئے ہے۔ خدا جانے اس کا سبب وہ انسان دوستی ہے جس سے اُردو کا خمیر اُٹھا ہے، یا پاکستان والوں کا وہ جذبۂ مہمان نوازی ہے جس کے متعلق علامۂ اقبال

مرحوم فرما گئے ہیں۔

مسلماں کے لہو میں ہے سلیقہ دلنوازی کا

لیکن کوئی نہ کوئی بات ہے ضرور جو اتنی مکمل تقسیم کے باوجود دلوں کو آپس میں ملائے ہوئے ہے۔

ادبی قدر دانی کی بات دوسری ہوتی ہے۔ اس کی ایک جھلک جہاں تک میری شعروشاعری کا تعلق ہے میں انگلستان اور یورپ کے بعض اور شہروں میں بھی دیکھ آیا ہوں۔ لیکن پاکستان کا معاملہ ہی کچھ اور ہے۔ اسے لفظوں میں بیان کرنا میرے لئے ممکن نہیں۔

مُدّت کی بات ہے میں پنجاب یونی ورسٹی لاہور کے مشاعرے میں شرکت کے بعد دہلی واپس آرہا تھا، میرے دوست محمد طفیل مُدیر "نقوش" نے مجھے رخصت کے وقت مٹھائی کا "ڈبہ" دیتے ہوئے کہا کہ تمھیں تو ہم یوں رخصت کرتے ہیں جیسے بیٹی کو گھر سے رخصت کیا جاتا ہے۔

میرے مُحبّ صادق میاں محمد شفیع ہندوستان کے بڑے بڑے لیڈروں سے ملاقات کرنے دہلی آئے۔ اُنھیں اپنی مصروفیات سے کچھ وقت جو ملا تو میرے پاس بھی تشریف لائے۔ جب چلنے لگے تو میں نے کہا، شفیع صاحب یہ ملاقات بہت مختصر رہی ہے۔ رات کو کھانا آپ غریب خانے پر میرے ساتھ کھائیے تاکہ کچھ دیر اور باتیں کرنے کا موقع ملے۔ کہنے لگے کھانا کھانے یا چائے پینے کی تو

مجھے فرصت ہی نہیں ہے۔ لنچ مولانا آزاد کے وہاں ہے، چائے جواہر لال نہرو کے یہاں۔ ڈنر راجہ غضنفر علی خاں کے یہاں۔ تم سے تو ملنے میں اس لئے آیا ہوں کہ تمھیں میں لاہور ہی کا ایک حصہ سمجھتا ہوں۔ اسی طرح جس طرح راوی اور لارنس باغ لاہور کے حصے ہیں۔

چودھری نذیر احمد خاں صدر بزم اکبر دہلی تشریف لائے۔ مجھے ان کے آنے کی اطلاع ملی۔ اشتیاقِ ملاقات دونوں طرف سے تھا۔ میں کرائے کے اسکوٹر میں بیٹھ کر ان سے ملنے جن پتھ ہوٹل پہنچا۔ وہ دروازے پر میرے انتظار میں کھڑے تھے۔ اسکوٹر کا کرایہ دس بارہ آنے سے زیادہ نہ تھا۔ میں دینے لگا تو انھوں نے مجھے منع کر دیا اور میرے آنے کی خوشی میں پانچ یا دس کا نوٹ اسکوٹر والے کو دے کر رخصت کر دیا۔

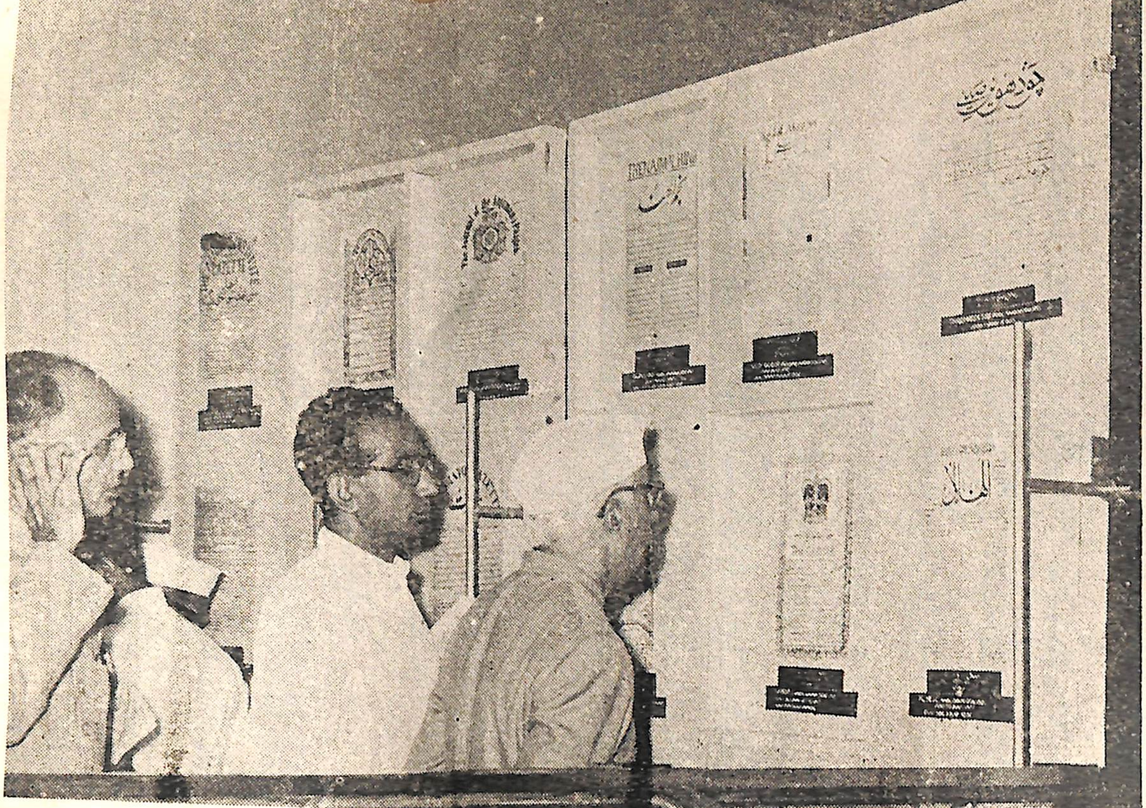
اب اس قسم کے واقعات میں کہاں تک گنتا چلا جاؤں، اور یہ میں کیسے بیان کروں کہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں نے میری زندگی کو کس حد تک متاثر کیا ہے۔

عمر تاں باد دراز اے ساقیانِ جامِ جم!

۱۹۵۵ء کے وسط میں میں انفارمیشن آفیسر مقرر ہو کر پریس انفارمیشن بیورو میں آگیا۔ شروع میں اردو سکشن کا میں انچارج رہا۔ سرکاری ملازمت کے دوران میں دفتر کے کسی کام کی خوبی کا اعزاز لینے کی کوشش کرنا صرف ضابطے کی رُو ہی سے غلط نہیں بلکہ خفیف الحرکتی بھی ہے۔ خدا جانے میں پریس انفارمیشن بیورو کے

ایک کارنامے کا ذکر کر کے ضابطے کی خلاف ورزی کر رہا ہوں کہ اپنی خفیف الحرکتی کا اظہار، لیکن میں قارئین کو اس اطلاع سے محروم بھی رکھنا نہیں چاہتا کہ ۱۹۶۱ء میں پریس انفارمیشن بیورو نے نئی دہلی میں جو اُردو نمائش منعقد کی اُس کی نظیر ہندوستان اور پاکستان کے کسی شہر میں ملنا ممکن نہیں۔ یہ اُس نمائش ہی کی برکت ہے کہ آج پریس انفارمیشن بیورو کے پاس اُردو کے ادیبوں، شاعروں، مدیروں اور پُرانے جرائد کی تصاویر کا مکمل تاریخوں کے ساتھ جو نادر ذخیرہ موجود ہے وہ ہندوستان یا پاکستان میں کسی ادارے کے پاس نہیں۔

اس نمائش کے تھوڑی مُدت بعد مجھے ایک نجی کام سلسلے میں انگلستان اور یورپ کا سفر درپیش آیا جس کی مکمل داستان میرے سفر نامے "سیرِ فرنگ" میں موجود ہے۔ اس سیاحت کے دوران میں اگرچہ یورپ کے کئی ملکوں مثلاً فرانس، جرمنی، بلجیم، سوئٹزرلینڈ، اٹلی، لکسمبرگ اور ہالینڈ جانے کا اتفاق ہوا لیکن ہسپانیہ کا سفر اس سیاحت کا حاصل تھا۔ اس سے قبل ہسپانیہ کی ایک جھلک میں نے "بالِ جبریل" کے اوراق میں دیکھی تھی، اور اس جھلک نے اس مُلک کو دیکھنے کی آتشِ شوق کو ایک مُدت سے بھڑکا رکھا تھا۔ چنانچہ انگلستان سے واپس آتے ہوئے میں نے ہسپانیہ کا رُخ کیا، اور طلیطلہ، قرطبہ، غرناطہ، اشبیلیہ، مُرسیہ وغیرہ دیکھتا ہوا ہندوستان واپس آیا۔ سفرِ ہسپانیہ کے تاثرات میرے سفر نامے میں بھی ہیں۔ الگ مقالات میں بھی اور میرے کلام میں بھی۔ لیکن ایک تاثر جس کا اظہار میں نے شاید ابھی تک نہیں کیا یہ ہے



اردو نمائش نئی دہلی (۱۹۶۱) کا ایک رُخ

کہ مسجدِ قرطبہ دیکھنے کے بعد اس حقیقت کا مجھ پر انکشاف ہوا کہ اقبال کی نظم "مسجدِ قرطبہ" کو جتنی بلند پایہ نظم میں پہلے سمجھتا تھا، اصل میں یہ نظم اُس سے بھی کہیں بلند تر ہے۔ میں اس نظم کو پہلے بھی اُردو کی سب سے بہترین نظم سمجھتا تھا لیکن اب تو اس کا رُتبہ میری نظر میں اس سے بھی زیادہ بلند ہو گیا ہے۔ کاش مجھے کبھی فرصت نصیب ہو تو میں اپنے اس تاثر کا اظہار قدرے وضاحت سے کروں۔

یوروپ سے واپسی پر اسی پریس انفارمیشن بیورو میں انفارمیشن آفیسر کی حیثیت ہی سے مجھے مرکزی وزارتِ خوراک کے ایک شعبے سنٹرل ویئر ہاؤسنگ کارپوریشن کے ساتھ وابستہ کر دیا گیا۔ سنہ ۱۹۶۳ء کے آخر تک میں نے اسی کارپوریشن میں کام کیا اور سالِ رواں کے شروع سے اسی حیثیت میں مرکزی وزارت نقل و حمل کے ساتھ وابستہ ہوں۔

اب رہی اپنی تصانیف کی بات، تو حسرت موہانی کا شعر ہے

ہے مشقِ سخن جاری چکّی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

میں اپنے یا اپنی طبیعت کے بارے میں تو کیا کہہ سکتا ہوں، لیکن دفتر کی زندگی کے ساتھ ساتھ مشقِ سخن ضرور جاری رہی ہے۔ اس وقت تک میری نظم و نثر کی جو کتابیں چھپ چکی ہیں اُن کی فہرست یہ ہے۔

بیکراں۔ ستاروں سے ذرّوں تک، نوائے پریشاں اور وطن میں اجنبی

اوّل الذّکر کتاب ہندی رسم الخط میں اور آخر الذّکر گجراتی رسم الخط میں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ ان مجموعوں کے علاوہ جن کے متعدّد ایڈیشن چھپ چکے ہیں، دو انتخابات بھی شائع ہوئے۔ ایک انجمن ترقیِ اُردو (ہند) علی گڑھ نے شائع کیا ہے۔ انتخاب جگن ناتھ آزاد، دوسرا اسٹار پبلیکیشنز دہلی نے شائع کیا ہے۔

کہکشاں۔ اُردو والو ابوالکلام آزاد، دو نظمیں ہیں جو کتابچوں کی صورت میں شائع ہوئی ہیں۔

نثر کی تین کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں۔

اقبال اور اُس کا عہد۔ جنوبی ہند میں دو ہفتے اور تلوک چند محروم

"اقبال اور اُس کا عہد" میرے تین توسیعی لیکچروں کا مجموعہ ہے، جو جمّوں و کشمیر یونی ورسٹی سری نگر کی دعوت پر میں نے لکھے۔ "جنوبی ہند میں دو ہفتے" ایک ادبی رپورتاژ ہے، اور "تلوک چند محروم" مختلف اہلِ قلم کے مقالات کا مجموعہ ہے، جو میں نے مُرتّب کیا ہے۔

ان مطبوعہ کتابوں کے علاوہ کلام کا ایک بڑا حصّہ غیر مطبوعہ ہے۔ اسے میں نے چار مجموعوں میں مُرتّب کیا ہے، اور اب ان مجموعوں کی اشاعت کا مرحلہ درپیش ہے۔

نثر کا ایک مجموعہ "نشانِ منزل" کے نام سے زیرِ طبع ہے۔ دو رپورتاژ اس کے علاوہ ہیں۔ "مشرقی پاکستان میں چند روز" اور "بانہال سے

اجنتا تک:

اس موقع پر مجھے حفیظ کا ایک شعر یاد آرہا ہے۔

ایسی جنس فراہم کرلی جس کا گاہک کوئی نہیں
لادے لادے پھرتا ہوں پشتارہ ارمانوں کا

اپنی کتابوں کے علاوہ والدِ محترم کی غزلوں، نظموں کے چھ مجموعے میں نے مرتّب کئے ہیں، جو زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں۔ اُن کی تفصیل یہ ہے۔

گنجِ معانی (نیا ایڈیشن)، رُباعیاتِ محرُوم (نیا ایڈیشن) کاروانِ وطن (قومی نظموں کا مجموعہ) نیرنگِ معانی (نیا ایڈیشن) شعلۂ نوا (غزلوں کا مجموعہ، نیا ایڈیشن) بہارِ طفلی (لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے نظمیں۔

ان کے علاوہ والد کی نظموں کے چار اور مجموعے میں اس وقت مرتّب کر رہا ہوں۔ ایک میں متفرق نظمیں ہیں۔ ایک منظوم تراجم پر مشتمل ہے۔ ایک میں اسکولوں کے لڑکوں اور لڑکیوں کے نظمیں شامل ہیں[1]۔ اور

---

[1] اس دوران میں یہ مجموعہ "بچّوں کی دُنیا" کے نام سے اشاعت پذیر ہوگیا ہے۔ باقی تینوں مجموعے زیرِ طباعت ہیں۔

ایا۔ اُن کے فارسی کلام کا مجموعہ ہے۔

میری مادری زبان پنجابی ہے۔ لیکن اوڑھنا بچھونا اردو ہے۔ غلط یا صحیح، اسی میں شعر کہتا ہوں، اور اسی کے ذریعے سے اپنا مافی الضمیر پڑھنے والوں اور اور سننے والوں تک پہنچاتا ہوں۔ اس زبان کو ایک ایسی زبان سمجھتا ہوں جس کی ترقی میں مجھے ہندوستان کی ترقی پنہاں نظر آتی ہے۔ اُردو کی ادبی روایات کو اپنا قومی سرمایہ سمجھتا ہوں، اور ایک مُحبّ وطن ہندوستانی کی حیثیت سے اُن پر فخر کرتا ہوں۔

۱۰۔ مارچ ۱۹۶۴ء